بسم اللہ الرحمن الرحیم

# حرف آغاز

[اس تحریر کا پہلا حصہ جو سلام ومصافحہ کی اہمیت سے متعلق ہے، استاذ العلماء حضرت مولانا عبدالغفار صاحب عراقی مئوی کے ایک رسالے ''ترغیب المتلاقیین فی المصافحہ بالیدین'' کے لیے تمہید کے طور پر لکھی گئی ہے، جو عنقریب شائع ہونے والا ہے]

اسلام میں مسلمانوں کے باہمی تعلقات کو بہت اہمیت دی گئی ہے، اور ان کے مختلف اور بکھرے ہوئے افراد کی شیرازہ بندی کرنے اور اجتماعیت کے مضبوط دھاگے میں پروکر ایک طاقت ور جسم بنانے کی تعلیم دی گئی ہے، تشتُّت و تحزُّب اور اختلاف وانتشار کو سخت معیوب قرار دیا گیا ہے، اسلام اپنے ماننے والوں کو خدا کی رسی کو پوری اجتماعی قوت کے ساتھ مضبوطی سے تھامنے اور گروہ بندی سے بچنے کی تعلیم دیتا ہے، وہ مسلمانوں کے تمام افراد کو ایک ایسے جسم کی طرح دیکھنا چاہتا ہے، جس کے ایک عضو یا حصے کو اگر کوئی تکلیف پہنچے تو پورا جسم بے چین ہو کر تکلیف سے تڑپ اٹھتا ہے، انتشار سے بچانے اور اجتماعیت کو فروغ دینے کے لیے معاشرے کے افراد میں محبت والفت، مواخاۃ ومساوات اور ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی اور غم خواری وغمگساری کی پرزور تعلیم دیتا ہے۔ نفرت وعداوت، بغض وحسد، کینہ پروری اور آپس کی دشمنی اور ناچاقی کو انتہائی نفرت کی نظر سے دیکھتا ہے۔

پیغمبر اسلام جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی پوری زندگی، اور تمام تعلیمات محبت والفت، بھائی چارگی، ہمدردی وغم خواری، حتی کہ غیر مسلموں اور دوسرے مذہب کے ماننے والوں کے ساتھ بھی حسن سلوک اور رواداری کا ایسا روشن اور خوبصورت نمونہ ہیں، جس کی کوئی نظیر پوری انسانی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔

مسلمانوں کے درمیان محبت واجتماعیت کو عام کرنے کے طریقوں میں سب سے بہترین ذریعہ اور وسیلہ ''سلام'' ہے۔ اسلام میں سلام کو پھیلانے پر بہت زور دیا گیا ہے، آقا ومولا جناب محمد

رسول اللہ ﷺ نے بڑے اہتمام سے اس کی طرف توجہ دلائی ہے، بار بار اس کی فضیلت بیان کی ہے، اور بہ کثرت اس کی ترغیب دی ہے۔ سلام کی اہمیت اس سے بڑھ کر کیا ہوسکتی ہے، کہ آنحضرت ﷺ مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے جب مدینہ منورہ تشریف لے گئے، تو سب سے پہلے آپؐ نے جو تعلیم دی ہے وہ سلام پھیلانے کی ہے، حدیث میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ جو یہودیوں کے اس وقت کے سب سے بڑے عالم اور جلیل القدر صحابی تھے، وہ کہتے ہیں کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے مدینہ تشریف لانے کے بعد جو سب سے پہلی بات بیان فرمائی وہ یہ ہے: **یـا أیّهـا الـنـاس! أفشُوا السّـلام، وَأَطْعِـمُوا الطَّعَامَ، وَصَلُّوا باللّيْلِ والنَّاسُ نِيَامٌ** (لوگو! سلام پھیلاؤ، کھانا کھلاؤ، اور رات میں جب لوگ سورہے ہوں تو نماز پڑھو)۔

اور حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ جو اجلۂ صحابہ اور عشرہ مبشرہ میں سے ایک ہیں، ان کی روایت میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ دوسری قوموں کی بیماری تم لوگوں میں بھی سرایت کرگئی ہے۔ یہ بیماری حسد، جلن اور کینہ ہے۔ یہ وہ بیماری ہے جو مونڈ دینے والی ہے، یہ بالوں کو نہیں مونڈتی بلکہ یہ دین کو مونڈ دیتی ہے۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، تم جنت میں نہیں جاؤ گے جب تک ایمان نہ لاؤ گے، اور مومن نہ ہوگے جب تک ایک دوسرے سے محبت نہ کرو گے، میں تم کو وہ چیز نہ بتادوں جو محبت کو تمھارے اندر راسخ کردے، وہ یہ ہے کہ آپس میں سلام پھیلاؤ۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں: **دَبَّ إلَيْـكُـم دَاءُ الْأُمَـم قَبْلَكُمْ: اَلْحَسَدُ وَالبَغْضَاءُ، هي الحَالِقَةُ، لا أقُولُ تَحْلِقُ الشَّـعْـرَ وَلٰـكِـنْ تَـحْـلِـقُ الـدِّيْـنَ، وَالَّـذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَا تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ حَتّٰى تُؤْمِنُوا، وَلَاتُؤْمِنُوا حَتّٰى تَحَابُّوا، أَفَلَا أُنَبِّئُكُمْ بِمَا يُثَبِّتُ ذَاكُمْ لَكُمْ أفْشُوا السَّلَامَ بَيْنَكُمْ** (ترمذی شریف)۔

اور کشف الاستار جلد ۳ صفحہ ۳۳۹ (تحقیق: حضرت محدث الاعظمی) میں حضرت ابوشریح (ھانی بن یزید رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے آنحضرت ﷺ سے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! مجھے کوئی ایسا عمل بتلا دیجئے جو مجھے جنت سے قریب کردے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: **أطْعِمِ الطَّعَام، وأفْشِ السَّلَامَ** (کھانا کھلاؤ، اور سلام پھیلاؤ)۔

لیکن یہ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ اسلام کی دیگر تعلیمات کی طرح آنحضرت ﷺ کی اس اہم تعلیم کی طرف سے بھی بے توجہی بڑھتی جارہی ہے، اور سلام کو پھیلانے اور اس کو رواج دینے کا

رجحان کم سے کم ہوتا جارہا ہے۔

اسلام کی اخلاقی تعلیمات اور محبت کے پیغامات میں سے ایک اہم پیغام دو مسلمانوں کی ملاقات کے وقت مصافحہ کرنا بھی ہے، اس سے آپس میں محبت اور دلوں میں نرمی آتی ہے، باہمی رنجش اور نااتفاقی دور کرنے کا یہ ایک بہت اچھا ذریعہ ہے، جس سے قلوب ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہیں، یہ سلام کا ایک تکملہ اور تتمہ ہے۔ احادیث نبویہ میں اس کے لیے بھی بہت ترغیب دی گئی ہے، اس کی فضیلت حدیث پاک میں یوں بیان کی گئی ہے: **مَا مِنْ مُسْلِمِيْنَ يَلْتَقِيَانِ فَيَتَصَافَحَانِ إِلَّا غُفِرَ لَهُمَا قَبْلَ أَنْ يَتَفَرَّقَا** (ترمذی شریف) دو مسلمان جب ملتے ہیں اور مصافحہ کرتے ہیں، تو ان دونوں کے جدا ہونے سے پہلے ان کے گناہ (صغیرہ) بخش دیے جاتے ہیں۔

مصافحہ کس طرح کرنا چاہئے، ایک ہاتھ سے یا دونوں ہاتھ سے، اس کو بھی تشنہ نہیں چھوڑا گیا ہے، احادیث نبویہ میں اس کے اشارات پائے جاتے ہیں، اور ائمہ و اہل علم کے طرز عمل سے اس سلسلے میں روشنی حاصل کی جاسکتی ہے کہ اسلام کی اس اہم، موکد اور پاکیزہ تعلیم کو کس طرح روبہ عمل لایا جائے۔

پیش نظر رسالہ اس بحث پر ایک نہایت عمدہ اور پُر مغز رسالہ ہے، جس میں دلائل کی روشنی میں پوری تحقیق کے ساتھ یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ مصافحہ دونوں ہاتھ سے کرنا چاہئے، یہی مسنون طریقہ ہے، حدیثوں سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے اور ائمۂ دین کے معمولات اور فقہاء کرام کے اقوال سے بھی، اس لیے اس فضیلت کو حاصل کرنے کے لیے دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کرنا چاہیے، صرف ایک ہاتھ ملانے پر اکتفا نہیں کرنا چاہئے۔

..........................................

چند دنوں پہلے اردو کے ایک روزنامہ میں یہ خبر نگاہ سے گزری کہ نئی دہلی میٹروپولیٹن کارپوریشن نے نئی دہلی کی اورنگ زیب روڈ کا نام تبدیل کرکے اے پی جے عبدالکلام روڈ رکھ دیا ہے۔ یہ خبر حد درجہ افسوسناک وتشویشناک ہے، یہ اقدام اے پی جے عبدالکلام کے ساتھ دوستی ومحبت سے زیادہ اورنگ زیب دشمنی پر مبنی ہے، اس سے کارپوریشن کے کارپردازوں کی متعصّبانہ وفرقہ پرستانہ ذہنیت اور ان کی تنگ دلی وتنگ نظری کا پتہ چلتا ہے، چنانچہ ملک کے متعدد نقاد اور غیر مسلم دانشوروں نے بھی اس اقدام کی کھل کر اور سختی سے مخالفت کی ہے، اور اس کو فرقہ پرستی پر مبنی اقدام قرار دیتے ہوئے فیصلے کو واپس لینے کی تلقین کی ہے، اور حکومت کو یہ صحیح اور مناسب مشورہ دیا ہے کہ اورنگ زیب روڈ کا نام برقرار رکھتے ہوئے

سابق صدر جمہوریہ کے نام پر کوئی تعلیمی یا سائنسی ادارہ قائم کر کے ان کی بہتر یادگار قائم کی جا سکتی ہے۔

اور واقعہ یہ ہے کہ ملک کی سائنسی ترقی وایٹمی قوت کے لیے عبدالکلام صاحب کی جو خدمات ہیں، ان کے اعتراف کا حق کسی سائنسی، ایٹمی یا بڑے تعلیمی ادارے کے قیام ہی سے ادا ہو سکتا ہے۔ ان کے نام پر کسی سڑک یا روڈ کا نام رکھ دینا اور وہ بھی نام بدل کر آزاد ہندوستان میں کلام صاحب کی خدمات کو دیکھتے ہوئے ان کے مقام سے فروتر ہے، جس میں کلام صاحب کی شخصیت سے زیادہ نام بدلنے والوں کی بدنیتی کا دخل ہے۔

دراصل ہندوستان کے عظیم الشان مسلم بادشاہ اورنگ زیب عالمگیر کی شخصیت بعض تنگ نظر اور فرقہ پرست تنظیموں کی نگاہ میں بری طرح کھٹکتی ہے، اور وہ تاریخ کے دریچوں اور ہندوستان کے دیوار ودر سے ان کی ایک ایک یادگار کو کھرچ کر مٹا دینا چاہتی ہیں، اور نئی نسلوں کو اس عادل اور انصاف پسند فرماں روا کی طرف سے مکمل طور پر بدگمان کر کے ان کے ذہن ودماغ کو مسموم کر دینا چاہتی ہیں، اورنگ زیب کی طرف سے بدظن کرنے کا یہ مذموم خیال ومسموم سبق بعض تنگ نظر انگریز مورخوں کا پڑھایا ہوا ہے، جنھوں نے اپنے دور حکومت میں مسلم بادشاہوں اور بالخصوص اورنگ زیب عالمگیر کو -غالباً ان کی دینداری وپرہیزگاری کی وجہ سے- بدنام کر کے برادران وطن کو ان کی طرف سے بدظن کرنے کی حتی المقدور کوشش کی، مگر اس وقت ان کی کوشش بہت زیادہ بارآور نہیں ہو سکی، اور متعدد غیر مسلموں دانشوروں اور مورخین نے تسلیم کیا کہ اورنگ زیب ایک انتہائی عدل گستر اور انصاف پرور حکمراں تھا، اس کا عہد حکومت عدل وانصاف کا سچا نمونہ تھا، اس مظلوم بادشاہ پر جو الزامات لگائے گئے ہیں وہ یکسر غلط اور بہتان ہیں، اس نے نہ کسی مذہب کو دبانے کی کوشش کی، اور نہ کسی کے مذہبی رسوم وروایات میں اپنے پچاس سالہ دور حکومت میں کبھی کوئی دخل اندازی اور رخنہ اندازی کی، اس کے دور حکومت میں مذہبی رواداری عام تھی، اس نے بہت سی مندروں اور غیر مسلم عبادتگاہوں کو جاگیریں اور زمینیں عطا کیں، افسوس ہے کہ بعض انگریز مفکروں نے اورنگ زیب کے خلاف جو تخم ریزی کی تھی، مختلف شکلوں میں اب اس کے برگ وبار ظاہر ہونا شروع ہو گئے ہیں، لیکن یہ خوشی ہے کہ آج بھی ملک میں وسیع النظر اور انصاف پسند لوگ موجود ہیں، جو فرقہ پرستی پر مبنی فیصلوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں، ان کی جس قدر تحسین وستائش کی جائے کم ہے، اللہ رب العزت ان کے احتجاج میں

تاثیر پیدا فرمادے، اور اس ملک کے سیکولرزم، ڈیموکریسی، اور مذہبی رواداری کو جس سے اس کی حقیقی شناخت اور پہچان ہے ہمیشہ باقی رکھے۔

..................................................

اسی ضمن میں ایک بات اور قابل ذکر ہے کہ دو دن پہلے الہ آباد ہائی کورٹ کی طرف سے ایک ایسا فیصلہ سامنے آیا ہے، جس میں مسلمانوں کو مدارس میں یوم آزادی و یوم جمہوریہ کے موقع پر قومی پرچم لہرانے کی نصیحت کی گئی ہے۔ مسلمانوں کو ہندوستانی عدلیہ پر پوری طرح اعتماد ہے اور وہ عدلیہ کے فیصلوں کو بسر وچشم قبول کرتے ہیں، تاہم یہ فیصلہ پوری طرح حیران کن اور باعث حیرت واستعجاب ہے، اس لیے کہ یہ ایک ایسی نصیحت ہے جس پر اہل مدارس آزادی اور ملک کے جمہوری ہونے کے بعد سے ہی عمل کرتے چلے آرہے ہیں، اور مدارس کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لی جائے کہ وہ ان دونوں دنوں کو پورے جوش وخروش اور تزک واحتشام کے ساتھ قومی جشن کے طور پر مناتے ہیں، ہندوستان کی عظمت اس کی طاقت وقوت، اس کی گنگا جمنی تہذیب اور قومی یک جہتی کے ترانے اور زمزمے گائے جاتے ہیں، مٹھائی اور شیرینی تقسیم ہوتی ہے، آزادی اور جمہوریت کا جشن منانے میں مسلمان اور مدارس دوسروں سے پیچھے نہیں بلکہ چند قدم آگے ہی رہتے ہیں، اور جس طرح ملک کے لیے قربانی دینے میں مسلمان ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں، اس قربانی کے نتیجے میں حاصل ہونے والی آزادی وجمہوریت کا جشن منانے میں بھی انشاء اللہ آئندہ اسی طرح آگے رہیں گے، جس طرح اب تک رہے ہیں۔ افسوس ہے کہ اس فیصلے سے کچھ مخصوص ذہنیت کے لوگوں کو مدارس کی طرف انگشت نمائی کا موقع مل سکتا ہے، جو غالباً کسی ایسی تنظیم کے کسی درخواست دہندہ کی درخواست پر سامنے آیا ہے، جن تنظیموں کا ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں کوئی کردار نہیں رہا ہے، جن کے خون کا کوئی قطرہ تو درکنار پسینہ بھی ملک کے لیے نہیں بہا، بلکہ انھوں نے آزادی کے علم بردار گاندھی جی کا خون بہایا، ان تنظیموں کو اہل مدارس اور مسلمانوں کو حب الوطنی کا درس دینے کے بجائے اپنی تاریخ کے سیاہ دھبوں کو دھوکر ملک کے سیکولر ڈھانچے، اس کی جمہوری روایات، تہذیبی اقدار اور تعمیری فکر اختیار کرنے کی کوشش کرنی چاہئے، جو اس ملک کی حقیقی طاقت وقوت ہیں، اور جس میں اس کی سالمیت کا راز مضمر ہے۔

۱۹؍ذیقعدہ ۱۴۳۶ھ

۴؍ستمبر ۲۰۱۵ء

یوم جمعہ

ماخوذ: از تفسیر عزیزی

# تفسیر سورۂ مطفّفین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

## وَيۡلٌ لِّلۡمُطَفِّفِينَ

خرابی ہے گھٹانے والوں کی

یعنی ہائے افسوس ان لوگوں کے اعمال پر جو ناپ تول میں لوگوں کے حقوق ضائع کرتے ہیں۔

**تطفیف کا وسیع مفہوم:**

تطفیف کا لفظ اگرچہ لغت میں ناپ تول میں خیانت کرنے کے معنی میں آتا ہے لیکن شیخ ابوالقاسم قشیری قدس سرہ اور دوسرے بزرگوں نے فرمایا کہ مندرجہ ذیل باتیں بھی تطفیف میں داخل ہیں:

۱:- لوگوں کے عیب ظاہر کرنا اور وہی عیب اپنے اندر ہو تو اس کو چھپانا۔

۲:- دوسروں سے انصاف کی خواہش رکھنا اور خود ان کے ساتھ انصاف کا معاملہ نہ کرنا۔

۳:- اپنے عیوب سے بے خبر رہنا اور دوسروں کے عیوب پر نظر رکھنا۔

۴:- لوگوں سے اپنی تعظیم کی خواہش رکھنا اور خود واجب التعظیم لوگوں کی تعظیم نہ کرنا۔

۵:- جو اپنے لیے پسند کرنا وہ دوسرے کے لیے پسند نہ کرنا۔

۶:- نوکروں، ملازموں سے پورا پورا کام لینا مگر ان کی تنخواہ دینے میں کوتاہی کرنا۔

۷:- اللہ تعالی سے اپنا مقدر رزق پورا پورا چاہنا اور اس کی اطاعت وفرمانبرداری میں کوتاہی کرنا،- یہ سب تطفیف میں داخل ہیں۔

چنانچہ حدیث شریف میں آتا ہے:

**"الصلوٰۃ مکیال فمن وفی، وفی له ومن طفف فقد علمتم ما قال الله تعالیٰ فیه"**

"کہ نماز بھی اللہ کے حق کی ادائیگی کا ایک پیمانہ ہے جس نے پورا پورا ادا کیا اس کو پورا پورا اجر عطاء ہوگا اور جس نے ڈنڈی ماری تو تمہیں معلوم ہے کہ تطفیف کرنے والوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے کیا فرمایا ہے"

حدیث قدسی ہے:''**أوف یا ابن آدم کما تحب أن یوفی لک وأعدل کما تحب أن یعدل لک**'' اے ابن آدم پورا پورا حق ادا کر جیسا اپنے لیے چاہتا ہے کہ تیرا حق پورا پورا ادا کیا جائے ،اور انصاف کر جیسا اپنے لیے چاہتا ہے کہ تیرے ساتھ انصاف کیا جائے۔

ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اِس سورت کی تلاوت فرمائی پھر مدینے کے لوگوں سے فرمایا''**خمس بخمس**'' (پانچ کے بدلے پانچ) پانچ گناہوں کے بدلے پانچ عذاب مسلط ہوتے ہیں۔

۱:- جو قوم عہد شکنی کرتی ہے اس پر دشمن مسلط کر دیے جاتے ہیں۔

۲:- جو قوم شریعت کے خلاف فیصلے کرے اور رشوت لے کر شریعت کا حکم تبدیل کر دے وہ فقر و افلاس میں گرفتار کر دیے جاتے ہیں۔

۳:-جن لوگوں میں زنا اور لواطت عام ہو جائے ان میں موت کی وبا پھیل جاتی ہے۔

۴:- جو لوگ ناپ تول میں خیانت کرنے لگ جائیں ان کی زراعت تباہ ہو جاتی ہے اور ان پر قحط مسلط ہو جاتا ہے۔

۵:- جو قوم زکوٰۃ دینا چھوڑ دے ان سے بارش روک لی جاتی ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ ناپ تول کا معاملہ بہت اہم ہے،حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم پر جو عذاب آیا تھا وہ اسی گناہ کی شامت میں آیا تھا۔

## تطفیف کا گناہ صغیرہ ہے یا کبیرہ؟:

اس کے کبیرہ ہونے میں علماء کا اختلاف رہے، ایک گروہ مبالغے کے طور پر یہاں تک کہتا ہے کہ اس برے کام کا ارادہ بھی کبیرہ گناہ ہے،اور بعض علماء اس کے اندر قلیل و کثیر کا فرق کرتے ہیں، یعنی اگر ناپ تول میں اتنی کمی کی کہ حد سرقہ کے نصاب کے برابر ہے، جو ہمارے ملک (ہندوستان) میں تین روپے رائج وقت ہے،تو کبیرہ ہے،اگر اس سے کم ہے تو صغیرہ ہے۔ (۱)

## تطفیف کے کبیرہ ہونے میں ایک شبہہ کا ازالہ:

بعض ظاہر بین لوگوں کو شبہہ ہوتا ہے کہ جتنی مقدار میں تطفیف ہوتی ہے اس قدر اگر کوئی کسی کا حق غصب کرے تو بالاجماع صغیرہ گناہ ہے پھر تطفیف کو کبیرہ میں کیوں شمار کیا جاتا ہے اور اس پر اتنی سخت وعید کیوں ہے؟

(۱) یہ حضرت مصنف رحمہ اللہ کے زمانے کے تین روپے کا حکم ہے، آج کے رائج روپے کا حکم نہیں ہے۔۱۲ اسفیر احمد

جواب اس کا یہ ہے کہ غصب ایک گناہ تو ہے مگر اس کے ضمن میں شریعت کا قلب موضوع لازم نہیں آتا (یعنی شریعت نے جو چیز جس مقصد کے لیے وضع کی ہے اس کو اس مقصد کے بالکل برعکس اور اُلٹ استعمال کرنا، اس کا ارتکاب غصب میں نہیں ہوتا اور تطفیف میں ہوتا ہے) تطفیف تو عدل کی صورت میں ظلم ہے۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ ناپ تول کے آلات کو اللہ تعالیٰ نے عدل وانصاف قائم کرنے کے لیے مقرر فرمایا ہے تو انسانوں کے معاملات کا مدار انہی دو چیزوں (ناپ تول) پر رکھا ہے، اگر انہی دونوں کو ظلم کا ذریعہ بنالیا جائے تو یہ ایسے ہی ہے جیسے عبادت کو گناہ کا ذریعہ بنالیا جائے، نیز تطفیف ایک ایسی خیانت اور فریب ہے جس سے انسان کے نفس کی خیانت کا پتہ چلتا ہے، بخلاف غصب کے۔ دوسرے یہ مزاج کا نہایت ہی گھٹیا پن، خساست اور ذلت ہے کہ پیسہ بھر جَو کی خاطر آدمی اپنا ایمان بیچ ڈالے، اور اللہ کے عدل کو ظلم کی صورت میں ظاہر کرے، ایسی ہی سنگین وجوہات کی بنا پر اس گناہ کی سنگینی بڑھ گئی جو دوسرے صغیرہ گناہوں کے اندر نہیں ہے۔

اگر چہ بعض بزرگوں سے منقول ہے کہ اپنے وقت کے بادشاہ کو نصیحت کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا تمھیں کچھ معلوم ہے مطفف کے بارے میں کیا وعیدیں آئی ہیں؟ تم جو قوم کا مال بغیر تول وحساب کے کھاتے ہو سوچ لو تمہارا کیا حشر ہوگا، لیکن ان کی مراد یہ ہے کہ بادشاہ کا ظلم اور تطفیف اس اعتبار سے دونوں ایک جیسے ہیں کہ دونوں میں شریعت کا قلب موضوع ہے جس طرح ناپ تول کے آلات شریعت نے عدل کرنے کے لیے مقرر کیے لیکن مطفف ناپ تول میں کمی کر کے اس مقصد کے بالکل الٹ میں ان کو استعمال کرتا ہے اسی طرح قدرت وسلطنت کا مقصد شریعت کی نظر میں عدل قائم کرنا اور ظلم کو مٹانا ہے اب بجائے اس کے بادشاہ اگر اپنی سلطنت وقدرت کو عدل کے مٹانے اور ظلم کو قائم کرنے میں استعمال کرے تو قلب موضوع لازم آیا یعنی شریعت کے مقصد کے بالکل برعکس اس نے سلطنت کو استعمال کیا، تو قلبِ موضوع میں یہ دونوں برابر ہو گئے۔

بہر حال اس گناہ میں مخلوق کی حق تلفی کے علاوہ دھوکہ دہی، فریب، حکمتِ الٰہی میں رخنہ اندازی کرنا اور ظلم کو عدل کی صورت میں ظاہر کرنا یہ ایسا ہے جیسے درمیان میں قرآن رکھ کر دھوکہ بازی کی جائے ایسی ہی خباثتیں جمع ہو جانے کی وجہ سے یہ کبیرہ ہوا ہے۔

(جب یہ معلوم ہو گیا کہ جو چیز جس مقصد کے لیے شرعاً مقرر ہے اس کے عکس میں اس کو

استعمال کرنا تطفیف ہے تو) اسی میں سے یہ بھی ہے کہ نجاست کو مسجد میں ڈالنا حرام ہے، کسی دوسری جگہ پھینکنا حرام نہیں ہے، لہذا دین کے کام کو دنیا کی غرض کے لیے کرنا اور صلحاء کی شکل بنا کر شیطانی کردار ادا کرنا، کھل کر اور واضح ہو کر دنیا کے کام کرنے سے اور فسق و فجور کرنے سے زیادہ بدتر ہے۔

ناپ تول میں کمی بعض اوقات لاپرواہی کی وجہ سے بھی ہو جاتی ہے، بعض لوگوں کے مزاج میں ہی لا ابالی پن ہوتا ہے وہ اپنا حق لینے میں بھی زیادہ کنج وکاوش نہیں کرتے اگر اپنے حق کے لینے میں یہ غفلت ہو تو مضائقہ نہیں لیکن اس غفلت ولا پرواہی کے نتیجے میں دوسرے کا حق ضائع ہو تو یہ بھی ناجائز ہے تاہم یہ ایسا شدید گناہ نہیں کہ اس پر ''ویل'' کے لفظ کے ساتھ وعید سنائی جائے، سو تطفیف کی اس قسم سے احتراز کرنے کے لیے مطففین کی ایک اور صفت آگے بیان کی ہے جس سے یہ معلوم ہو گیا کہ ان کی یہ تطفیف کسی غفلت یا مزاج کے لا ابالی پن کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ یہ لوگ جان بوجھ کر کمال ہشیاری و چالاکی سے اور انتہائی حرص ولالچ کی وجہ سے تطفیف (ناپ تول میں کمی) کرتے تھے، وہ صفت یہ ہے:

اَلَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ۝

وہ لوگ کہ جب ماپ کر لیں لوگوں سے تو پورا بھر لیں

یعنی لوگوں پر ان کا جو حق ہے اس کو پورا بھر لیتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے حق سے ایک دانہ بھی کم نہ ہو، بلکہ پورا لینے کے بہانے وہ تھوڑا سا زیادہ لے لیتے ہیں اور صفائی یہ پیش کرتے ہیں کہ ہمیں اپنا حق پورا وصول ہونے میں اس وقت تک یقین نہیں آتا جب تک تھوڑا سا زیادہ نہ لے لیں۔

## ماپنے کا ذکر ہے تول کا نہیں اس کی کیا وجہ ہے؟

اور جب ناپ میں وہ حیلہ کرتے ہیں تو، تول میں بدرجۂ اولیٰ پورا کرنے کے بہانے زیادہ لیتے ہیں، اس لیے کہ ناپ میں عام طور پر کمی بیشی میں چشم پوشی کرنے کا رواج ہے جب کہ تول میں ایسا نہیں وہاں تنگی کا رویہ ہوتا ہے (لہذا وزن کو ذکر کرنے کی ضرورت نہ رہی)

## بعض اشیاء میں ناپ اور بعض میں تول کے رواج کی حکمت:

اور یہ بات کہ ماپنے میں کشادہ دلی کا معاملہ ہوتا ہے اور تول میں تنگی، اس کا راز یہ ہے کہ ناپ کا تعلق اشیاء کی لمبائی چوڑائی کے ساتھ ہے اور تول کا تعلق اشیاء کے وزن بوجھ سے ہے سو جن

چیزوں کے ساتھ انسان کا تعلق لباس وسکونت کے طور پر ہے جیسے کپڑا، زمین، ان کے اندر ناپ وپیمائش رائج ہے، اور جن کا تعلق انسان کی باطنی قوتوں کے ساتھ ہے مثلاً غذا ودوا، یا جن کا تعلق مالیت کے ساتھ ہے جیسے سات دھاتیں کہ جن کے بغیر دنیا کا نظام نہیں چلتا جیسے سونا، چاندی، لوہا، اور تانبا وغیرہ ثقل وبھاری پن کی وجہ سے ان کے اجزا ٹھوس شکل میں یک جا جمع ہیں، اور اجزا اس طرح یکجا ہونے کی وجہ سے یہ لمبے عرصہ تک باقی رہتے ہیں ختم نہیں ہوتے اور طولِ بقا کی وجہ سے ان کی مالیت زیادہ ہوگئی یعنی ہر آدمی ان کے حاصل کرنے کی خواہش رکھتا ہے، اس وجہ سے ان کے اندر وزن رائج ہوا (کہ ہر شخص کی شدید خواہش ہے کہ یہ چیزیں حاصل ہوں لہٰذا ان کا لین دین کرتے وقت لینے والا اور دینے والا اپنے حق میں ذرا بھی چھوٹ دینے کے لیے تیار نہیں، سوان کے لین دین کے لیے وزن کا طریقہ رائج ہوا، تاکہ ہر ایک کا حق ٹھیک ٹھیک اس کو ملے)

یہی وجہ ہے کہ جو چیزیں گھٹیا ہوتی ہیں ان میں اکثر ناپ وپیمائش ہوتی ہے اور جو چیزیں اعلیٰ ونفیس ہیں وہ تولی جاتی ہیں تاہم کبھی کبھی اس کے خلاف بھی ہوتا ہے کہ خسیس چیزیں تولی جاتی ہیں اور نفیس چیزوں میں پیمائش وناپنے کا عمل ہوتا ہے جیسے شلغم، گاجر وغیرہ تولی جاتی ہیں اور کمخواب وگوٹا کناری کی پیمائش ہوتی ہے، حاصل کلام یہ ہے کہ اس آیت میں وزن کا ذکر نہ کرنا اور فقط ناپ (اکتیال) پر اکتفاء کرنا اس میں بھی خاص راز وحکمت ہے (جس کی تفصیل بیان ہوگئی)

## آیت میں صرف کیل پر اکتفاء کی وجہ میں دوسرا قول:

اس آیت میں اکتیال پر اکتفاء کرنے اور وزن کا ذکر نہ کرنے کی بعض اذکیاء نے یہ وجہ بیان کی ہے کہ تول کر لینے کی صورت میں خریدار کے لیے زیادہ لینا ممکن نہیں اس لیے کہ ترازو بیچنے والے کے ہاتھ میں ہوتا ہے اگر دو دانے بھی زیادہ پڑ جائیں تو ترازو کا پلہ جھک جائے اور زیادتی ظاہر ہوجائے تب بیچنے والا زائد کو فوراً کم کردے گا، لیکن ناپ یا ماپ کر لینے کی صورت میں خریدار اگر کچھ زائد لینا چاہے تو ممکن ہے، اس طرح کہ مثلاً پیمانے کو ذرا ہلا دے تاکہ دو چار دانے زیادہ سما سکیں یا کپڑا ماپتے ہوئے ذرا جھول دے دے تو کچھ زائد آجائے گا، اسی لیے اس آیت میں یہ نہیں فرمایا کہ وزن کر کے لیتے ہوئے اس طرح بھر کر لیتے ہیں کہ کچھ زائد بھی آجائے کہ ایسا ممکن نہیں، اور ناپ کر لینے میں اس کا امکان ہے لہٰذا اسی پر اکتفاء کیا، بخلاف اس صورت کے کہ جب دوسرے کا حق دینا ہو اس وقت چونکہ ترازو اور ناپ دونوں دینے والے کے ہاتھ میں ہیں لہٰذا دونوں میں خیانت کا ارتکاب ہوتا

ہے اس لیے آنے والی آیت میں جس میں یہ صورت مذکور ہے وہاں دونوں کو ذکر فرمایا ہے۔

**''علیٰ'' لانے کی وجہ:**

''اذا اکتالوا علی الناس'' میں ''علیٰ'' لانے کی وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ ناپ کر کے لینے میں دوسروں کو ضرر پہنچانے کا ارادہ رکھتے ہیں صرف اپنا حق پورا لینا ہی ان کا مقصد نہیں ہوتا تھا (اس لیے ''علی'' لائے جو ضرر پر دلالت کرتا ہے) ورنہ اکتیال ''من'' کے ساتھ متعدی ہوتا ہے چنانچہ یوں کہا جاتا ہے ''اکتلتُ منک''

**وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ۝**

اور جب ماپ کر دیں ان کو یا تول کر تو گھٹا کر دیں

''کیل'' اور ''وزن'' کا لفظ جس طرح لغت میں ناپنے اور تولنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اسی طرح ناپ کر دینے اور تول کر دینے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، لہٰذا ''ھم'' ضمیر سے پہلے ''لام'' مقدر ماننے کی ضرورت نہیں جیسا کہ بعض مفسرین کی رائے ہے، وہ کہتے ہیں کہ ''لام'' مقدر ہے گویا مراد یوں ہے ''کالوا لھم او وزنوا لھم'' وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ لام اگر مقدر نہ مانیں تو معنی یہ ہوگا کہ ''ان لوگوں کو ناپتے ہیں یا ان کو تولتے ہیں'' اور یہ درست نہیں اس لیے کہ وہ مطففین لوگوں کو نہیں ناپتے تولتے تھے بلکہ ان کے اموال کو ناپتے تولتے تھے اس لیے لام کو مقدر ماننا ضروری ہے، اور لام چونکہ اکثر نفع کے لیے آتا ہے تو کثرت استعمال کی وجہ سے اس کو حذف کر دیا۔

(مگر یہ رائے درست نہیں جیسا کہ اوپر ذکر ہوا کہ کیل و وزن ناپ کر دینے اور تول کر دینے کے معنی میں بھی استعمال ہوتے ہیں) نیز لام کو نفع کے لیے مقدر ماننے کی صورت میں کلام کے اندر تناقض کا وہم پیدا ہوتا ہے کیونکہ مقصود تو یہ بتلانا ہے کہ وہ لوگ دیتے وقت لوگوں کے ضرر و نقصان کا ارادہ کیا کرتے تھے۔

**ناپ تول کے اعتبار سے لوگوں کی قسمیں:**

لین دین کا معاملہ کرتے ہوئے گھٹانے بڑھانے کے اعتبار سے لوگوں کی چار قسمیں ہو سکتی ہیں۔

۱:- لیتے وقت اور دیتے وقت پورا بھرے۔

۲:- دونوں صورتوں میں گھٹا دے۔
۳:- دینے میں تو گھٹائے مگر لیتے وقت پورا پورا لے، یہی صورت اس آیت میں مذکور ہے۔
۴:- دے پورا مگر لے کم، یہ اعلیٰ مرتبہ ہے اور بڑے حوصلہ والوں کا کام ہے۔

ان میں سے پہلی دونوں صورتوں کو یہاں اس لیے ذکر نہیں فرمایا کہ اگر چہ ان میں بھی قباحت وحرمت موجود ہے لیکن اس درجہ شدید برائی ان میں نہیں کہ ایسوں کو حال پر ''ہائے افسوس کہا جائے'' کیونکہ دینے کا نقصان لینے کے نقصان کا بدلہ ہو جاتا ہے، اسی طرح زیادہ لینا زیادہ دینے کا معاوضہ ہو جاتا ہے، تو ان میں ایک اعتبار سے نیکی اور ایک اعتبار سے برائی پائی گئی۔

## قرض وصول کرنے اور ادا کرنے کے اعتبار سے لوگوں کی چار قسمیں:

یہ چار قسمیں اس حدیث پر قیاس کر کے نکالی گئی ہیں جس میں یہ آتا ہے کہ قرض کے معاملے میں لوگ چار قسم کے ہیں۔

۱:- وہ شخص جو لوگوں سے اپنا قرض بسہولت وصول کرتا ہے اور لوگوں کا قرض جو اس کے ذمے ہے وہ بھی اچھے طریقے سے ادا کرتا ہے، یہ سب سے بہتر آدمی ہے۔

۲:- وہ شخص جو اپنا قرض لوگوں سے نہایت شدت و بے مروتی سے وصول کرتا ہے اور لوگوں کا قرض بھی نہایت شدت اور ایذاءدہی سے ادا کرتا ہے یہ سب سے بدتر آدمی ہے۔

۳:- وہ شخص جو لوگوں کا قرض بخوبی ادا کر دیتا ہے اور اپنا قرض نہایت شدت سے وصول کرتا ہے۔

۴:- وہ شخص جو لوگوں کا قرض برے طریقے سے ادا کرتا ہے مگر اپنا قرض بہت نرمی اور سہولت سے وصول کرتا ہے، یہ دونوں قسمیں درمیانی ہیں، ان میں ایک جانب خوبی اور دوسری جانب برائی ہے، یہ دونوں قسمیں خالص برائی سے بہتر ہیں۔

## غصے کے معاملے میں لوگوں کی چار قسمیں:

اسی طرح غصے کے معاملے میں فرمایا لوگوں کی چار قسمیں ہیں۔
۱:- جو جلد غصے میں آجائے اور جلد ہی راضی بھی ہو جائے۔
۲:- دیر سے غصے میں آئے اور دیر سے راضی ہو، یہ دونوں درمیانی قسمیں ہیں۔
۳:- جلد غصے میں آجائے اور دیر سے راضی ہو، یہ بدترین آدمی ہے۔
۴:- دیر سے غصے میں آئے اور جلد راضی ہو جائے یہ سب سے افضل آدمی ہے۔

# الازہارالمربوعہ
(مسلسل)

محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ

## صاحب آثار لکھتے ہیں:

ثالثاً بفرض محال...... یہ گزارش ہے کہ ابوداؤد نے...ابن جریج کی روایت سے اصح کہا ہے ...نہ کہ ابن اسحاق کی روایت سے......اور گفتگو ابن اسحاق کی روایت میں ہے الخ (مختصراً ص۵۲)

**جواب:**- مجیب کا یہ جواب ان کے اکثر جوابوں کی طرح صرف ابن القیم ہی کا طبعزاد نہیں ہے بلکہ یہ ابن تیمیہ کی کنجکاوی کا بھی نتیجہ ہے، چونکہ اس جواب کی ''ایجاد'' میں بڑی بڑی ہستیاں شامل ہیں اس لیے کچھ تو کہہ نہیں سکتا ہاں اتنا کہوں گا کہ اس جواب کے موجدوں نے اس پر غور نہیں کیا کہ ابوداؤد نے صرف اتنی بات پر اکتفا نہیں کیا ہے کہ نافع وغیرہ کی حدیث ابن جریج سے اصح ہے بلکہ اصح ہونے کی یہ وجہ بھی ذکر کی ہے کہ نافع وغیرہ کی روایت صاحب واقعہ کے گھر کی روایت ہے اس لیے گھر والوں کا بیان زیادہ قابل اعتبار ہے، جیسا کہ خود مجیب نے بھی اس کو تسلیم کیا ہے۔ پس اب مجیب ہی بتائیں کہ ابوداؤد کی یہ وجہ ترجیح ابن اسحاق کی حدیث کے مقابلہ میں بھی نافع وغیرہ کی حدیث پر منطبق ہے یا نہیں، یعنی یہ کہا جاسکتا ہے یا نہیں کہ چونکہ ابن اسحاق کی حدیث (جس میں یہ مذکور ہے کہ رکانہ نے تین طلاقیں دیں) بیرونی شہادت ہے اور نافع۔۔۔کی حدیث (جس میں یہ مذکور ہے کہ رکانہ نے لفظ بتــــــہ سے طلاق دی) صاحب واقعہ کے گھر والوں کا بیان ہے اس لیے نافع وغیرہ کی حدیث ابن اسحاق کی حدیث سے اصح ہے؟ ظاہر ہے کہ ہاں کے سوا اس کا کوئی جواب نہیں ہوسکتا[1] پس ابوداؤد کی اس وجہ سے ابن اسحاق کی حدیث سے بھی نافع کی حدیث کا اصح ہونا ثابت ہوتا ہے، اور جن لوگوں نے ابوداؤد کی ترجیح کو ابن جریج کی حدیث کے ساتھ خاص کیا ہے انھوں نے غور نہیں

(۱) چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ابوداؤد کی ترجیح کا ذکر فتح الباری میں ابن اسحاق ہی کی حدیث کا جواب دینے کے لیے کیا ہے جیسا کہ آئندہ آئے گا ۱۲ منہ

فرمایا ہے یا قصداً وجہ ترجیح سے اغماض کیا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے اس لیے کہ ابن القیم نے جہاں اپنے شیخ کے اس جواب کا ذکر کیا ہے وہاں ابوداؤد کی اس وجہ کا ذکر نہیں ہے بلکہ ان کے شیخ کی ایک خود تراشیدہ وجہ کا ذکر ہے (دیکھو اعلام ج ٢ ص وتعلیق مغنی ص ٤٥٠ واغاثہ) اور ہمارے مجیب چونکہ نقل را چہ عقل کے اصول پر پورے کاربند ہیں اس لیے جو جواب ان کے موافقین نے دیا ہے بے سوچے سمجھے نقل کردیتے ہیں چاہے اس کا موقع ہو یا نہ ہو۔ میں مجیب سے پوچھتا ہوں کہ آخر انھوں نے یہاں پر ابوداؤد کی پوری عبارت کو لحاظ میں کیوں نہیں رکھا اور اس جواب کے موجدوں کے ساتھ ساتھ مجیب نے بھی ابوداؤد کی عبارت میں قطع برید سے کیوں کام لیا، اور ان کی وجہ سے اغماض کر کے اپنی طرف سے ایک وجہ کیوں تراشی، اور یہ بھی ارشاد ہو کہ ابوداؤد کی عبارت کا صرف ایک ٹکڑا لے لینا اور اپنی طرف سے وجہ تراشنا بھی غلط بیانی و مغالطہ دہی ہے یا نہیں۔

### صاحب آثار لکھتے ہیں:

برتقدیر تسلیم......اصل یہ ہے کہ ابوداؤد نے اصح الضعیفین کے اعتبار سے اصح فرمایا ہے یعنی دوضعیف حدیثوں میں سے ایک دوسرے کے اعتبار سے اصح ہے نہ یہ کہ حقیقت میں صحیح ہے الخ (آثار ص ٥٢)

**جواب:** — یہ جواب بھی ابن القیم کا ہے، اور یہ بھی بے غوری کا نتیجہ ہے۔

اولاً اس لیے کہ ابوداؤد نے عبداللہ بن علی کی حدیث کو ابن جریج کی حدیث سے اصح کہنے کے بعد صرف ابن جریج کی حدیث کے ضعفِ اسناد کی طرف اشارہ کیا ہے جیسا کہ خود مجیب صاحب نے ص ٥٢ میں تسلیم کیا ہے اور عبداللہ کی حدیث کے ضعفِ اسناد کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا ہے [1] جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ حدیث عبداللہ کو ضعیف نہیں سمجھتے، لہذا ان کے کلام کی مذکورہ بالا توجیہ مالا یرضی بہ قائلہ ہے بلکہ مجیب کے مسلمہ اصول کے بھی خلاف ہے۔

ثانیاً: — بفرض محال اگر یہ توجیہ درست بھی ہو تو اس سے ہمارے مدعا کو کیا نقصان پہنچتا ہے بہرحال آپ نے یہ تو مان ہی لیا کہ ابوداؤد نے روایت بتـــہ کو ترجیح دی ہے اور یہی ہمارا مدعا تھا۔ اب اگر یہ کہیے کہ ہاں ہم ابن جریج کی روایت ثـلاثاً کے مقابلہ میں روایت بتـہ کی ترجیح کو مانتے ہیں لیکن

(١) بلکہ ابوداؤد نے اس سند پر سکوت کیا ہے اور مجیب صاحب کے نزدیک ابوداؤد کا سکوت حدیث کے صحیح ہونے کی دلیل ہے (آثار ص ٤٦) ١٢ منہ

ابن اسحاق کی روایت ثلاثاً کے مقابلہ میں نہیں مانتے تو یہ وہی بات ہے جس کو آپ ثالثاً کے ماتحت لکھ چکے ہیں اور اس کا جواب دیا جا چکا ہے۔ یہاں پر اتنا اور لکھا جاتا ہے کہ ابوداؤد نے روایت بتہ کو درایۃً ترجیح دی ہے، لہذا حدیث ابن اسحاق کے رواۃ کی ثقاہت کا ذکر یہاں پر بے موقع ہے اس کا موقع جہاں تھا وہاں اس کو آپ لکھ چکے ہیں اور اس کی حقیقت بھی منکشف کی جا چکی ہے، یہاں پر درایۃً کوئی وجہ ترجیح ہو تو بولیے ورنہ چپ رہیے باقی آپ نے جو یہ لکھا ہے کہ ''امام بخاری نے بتہ والی روایت کو معلول کہا ہے'' اور ''واقعہ یہ ہے کہ یہ روایت ہر اعتبار سے غلط ہے'' تو گزارش ہے کہ اب ان باتوں کو بھول جائیے۔ اور آپ سے جو سوال کیا گیا ہے اس کا جواب دیجئے، نیز یہ کہ ایسا بے دلیل دعویٰ تو ایک جاہل بھی کر سکتا ہے، کمال تو جب ہے کہ دلیل پیش کیجئے۔ پھر یہ بھی غور طلب ہے کہ جب روایت بتہ آپ کے نزدیک ہر اعتبار سے غلط ہے تو آگے آپ نے یہ کیسے لکھ دیا کہ ''ابوداؤد نے اصح الضعیفین کے اعتبار سے اصح فرمایا ہے'' کہئے جب ہر اعتبار سے غلط ہے تو پھر کسی اعتبار سے اصح کیسے ہوگئی؟ مجیب صاحب اب آپ کو اندازہ لگتا ہوگا کہ آپ کتنے پانی میں ہیں۔

### صاحب آثار لکھتے ہیں:

**خامساً:** -ابوداؤد کے کلام میں ابن جریج کی روایت کے ضعیف کی وجہ یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ...... **بعض بنی ابی رافع** ......معلوم نہیں کون ہیں لہذا اس جہالت کی وجہ سے یہ حدیث ضعیف ہوئی، میں کہتا ہوں یہ وجہ بھی صحیح نہیں کیونکہ مستدرک حاکم میں اس کی تعیین ہوگئی ہے کہ وہ محمد بن عبید اللہ ہیں (الی) لیکن انصاف ہے کہ یہ روایت ضعیف ہے استدلال کے قابل نہیں ہاں تائید پیش کی جائے تو مضائقہ نہیں (آثار ص۵۳)

**جواب:** - ناظرین دیکھیں کہ حدیث ابن جریج کی سند میں جو مجہول تھا اس کی تعیین کے بعد بھی جب یہ حدیث ضعیف ہی ہے تو مجیب کے اس جواب کا منشا بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ ابوداؤد وغیرہ جس راوی کی تعیین نہیں کر سکے تھے اس کو حضرت علامہ مجیب نے معلوم کر لیا۔ لیکن ناواقف ناظرین کو معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ بھی مجیب کا صرف ادعا ہی ادعا ہے اس لیے کہ اس مجہول کی تعیین مجیب نے نہیں کی ہے بلکہ مولانا خلیل احمد حنفی نے کی ہے مجیب نے مولانا کی عبارت نقل کی ہے لیکن ترجمہ نہیں کیا ہے تا کہ عوام آپ ہی کا کارنامہ اس کو تصور کریں۔

بہرحال مقصود ابن جریج کی حدیث کے ضعف سے ہے چاہے جہالتِ راوی کے سبب سے ہو یا ضعفِ راوی کے سبب سے ہو۔اب رہا مجیب کا یہ لکھنا کہ ''استدلال کے قابل نہیں ہے'' تو اس کی نسبت گزارش یہ ہے کہ پھر علامہ ابن القیم نے اس حدیث سے زاد المعاد ج ۷ ص ۸۵ میں کیوں استدلال کیا؟ اور مولانا ڈیانوی نے تعلیق مغنی میں اس حدیث کو بضمن ادلہ صریحہ کیوں شمار کیا؟ اور اس کو جید الاسناد کیوں کہا؟ کیا جس طرح ابوداؤد کے اعتراض کو آپ نے غلط کہا ہے اسی طرح ابن القیم اور مولانا ڈیانوی کی نسبت بھی یہ لکھنے کی جرأت کریں گے، کہ ابن القیم کا استدلال اور مولانا ڈیانوی کا جید الاسناد کہنا نیز استدلال کرنا غلط ہے؟

اور آگے مجیب لکھتے ہیں کہ ''ہاں تائیداً پیش کی جائے تو کوئی مضائقہ نہیں'' اس کی نسبت گزارش ہے کہ مجیب نے یہاں پر جو ''انصاف'' بیان کیا ہے، یہی وہ انصاف ہے جس کا نام انھوں نے ''خیانتی انصاف'' رکھا ہے (دیکھو آثار ص ۱۲۷) یا جس کو برعکس نہند نام زندگی کافور کا پورا پورا مصداق لکھا ہے (دیکھو آثار ص ۱۳۶) اس لیے کہ اولاً تو انھوں نے محمد بن عبید اللہ کی نسبت بجز اس کے کہ ابن حبان نے ان کو ثقات میں ذکر کیا ہے اور کوئی قول نقل نہیں کیا ہے حالانکہ جہاں سے انھوں نے اس کو نقل کیا ہے وہیں پر سخت سخت جرحیں بھی منقول ہیں اب مجیب صاحب ص ۸۸ والی تنبیہ اور ص ۹۸ والی کاٹ چھانٹ وغیرہ کی نسبت فرمائیں کہ وہ کس پر صادق آتی ہے۔

ثانیاً:- مستدرک سے اس کا صحیح الاسناد ہونا تو مجیب نے نقل کیا لیکن مستدرک کے اسی صفحہ میں ذہبی نے اپنی تلخیص میں حاکم پر جو تعقب کیا ہے اور فرمایا ہے **محمد واہٍ والخبر خطأ وعبد یزید لم یدرک الاسلام** (یعنی محمد بن عبید اللہ بالکل ہی کمزور واز کار رفتہ ہیں اور حدیث غلط ہے، عبد یزید نے اسلام کا زمانہ ہی نہیں پایا) اس کو نہیں نقل کرتے ،اس انصاف و دیانت کے قربان جایئے۔

ثالثاً:- محمد بن عبید اللہ کی اس حدیث کو آپ نے صرف ''ضعیف'' لکھا اور ہماری کسی حدیث کو ''سخت ضعیف سے'' کم نہیں لکھا ہے، کیا اسی کا نام انصاف ہے۔مثال کے طور پر حدیث دوم یا سوم یا چہارم کو لے لیجئے ،اور ان کے جن رواۃ پر جو جرحیں آپ نے نقل کی ہیں ان کو بھی سامنے رکھ لیجئے اس کے بعد کتب رجال میں محمد بن عبید اللہ کا حال پڑھئے اور اس کے بعد خدا کو گواہ کر کے بتایئے کہ حدیث دوم یا سوم و چہارم کے رواۃ پر زیادہ سخت جرح ہے یا محمد بن عبید اللہ پر۔میں آپ کی آسانی کے

لیے کتب رجال سے ان جرحوں کو نقل کیے دیتا ہوں جو محمد بن عبید اللہ پر کی گئی ہیں۔

۱:-**ابن معین**- **لیس حدیثه بشئ**،یعنی ان کی حدیث کوئی چیز نہیں ہے(میزان)

۲:-**ابوحاتم**-**منکر الحدیث ذاهب** (میزان)**ضعیف الحدیث منکر الحدیث جداًذاهب** (تہذیب)(یعنی محمد بن عبید اللہ بہت زیادہ منکر الحدیث،اور بالکل گیا گزرا ہے،ضعیف الحدیث ہے)

۳:-**امام بخاری**-**منکر الحدیث** یعنی محمد مذکور منکر الحدیث ہے،(میزان وتہذیب)

۴:-**دار قطنی**- **متروک وله معضلات** (تہذیب)یعنی محمد بن عبید اللہ متروک ہیں اوران کے لیے معضلات ہیں۔

۵:-**ابن عدی**-**هو في عداد شیعة الکوفة** (میزان)وہ کوفہ کے شیعوں میں شمار ہوتے ہیں۔

۶:-**ذہبی**-**واہٍ** یعنی سخت کمزور ہیں،(تلخیص مستدرک)**ضعفوہ** محدثین نے ان کو ضعیف کہا ہے(میزان)

۷:-**ابن حجر**-**ضعیف** یعنی وہ ضعیف ہیں،یہ لفظ ابن حجر اس راوی کی نسبت لکھتے ہیں جس کے باب میں کسی معتبر کی کوئی توثیق نہ ملے(دیکھو دیباچہ تقریب)اور مجیب صاحب نے لکھا ہے کہ ابن حجر نے اعدل اقوال لکھنے کا التزام کیا ہے(دیکھو ص۔۔۔)پس خود مجیب تحقیق سے بھی یہ لازم آیا کہ محمد کی کسی معتبر شخص نے توثیق نہیں کی ہے۔

۸:-**صاحب خلاصہ**-نے صرف جرح نقل کرنے پر اکتفا کیا ہے۔

اور عبد الحق نے لکھا ہے لیس فی بن ابی رافع من یحتج بہ یعنی ابو رافع کا کوئی لڑکا قابل احتجاج نہیں ہے(دیکھو احکام قلمی)

اس کے ساتھ یہ بھی سن لیجئے کہ بجز ابن حبان کے اور کسی نے ان کو ثقات میں ذکر نہیں کیا ہے نہ کسی نے توثیق کی ہے برخلاف حدیث دوم وسوم اور چہارم کے رواۃ کے کہ اولاً تو ان کے بارے میں اتنی سخت جرحیں نہیں ہیں دوسرے ہر راوی کی متعدد محدثین کبار نے توثیق بھی کی ہے،باوجود اس کے مجیب کا انصاف یہ ہے کہ وہ تینوں حدیثیں سخت ضعیف ہیں(آثار ص ۱۰۸و۱۰۹)اور ابن جریج والی

حدیث صرف ضعیف ہے، اورتائیداً پیش کی جائے تو کوئی مضائقہ نہیں، اناللہ وانا الیہ راجعون

**رابعاً:-** مجیب نے آثار ص۱۰۰ میں لکھا ہے کہ ”امام بخاری فرماتے ہیں کہ جس راوی کے متعلق میں منکرالحدیث ہوں اس سے روایت کرنا حرام ہے“ پس بتایا جائے کہ جب محمد بن عبیداللہ کی نسبت بخاری نے منکرالحدیث کہا ہے تو اس سے روایت کرنا حرام ہوا یا نہیں؟ اگر حرام ہوا تو اس کی روایت کو تائیداً پیش کرنے میں کوئی مضائقہ کیوں نہیں ہے؟ کیا یہی انصاف ہے؟

**خامساً:-** عراقی، سخاوی، اور دیگر علمائے حدیث نے تصریح فرمائی کہ جس راوی کو **ضعیف الحدیث جداً، یاذاهب**، یامتروک کہا گیا ہو اس کی حدیث سے تائید واعتبار بھی جائز نہیں ہے (دیکھو فتح المغیث وغیرہ) پس جب محمد بن عبیداللہ میں یہ سب اوصاف عالیہ جمع ہیں تو اس کی حدیث کو تائیداً پیش کرنے میں کوئی مضائقہ کیوں نہیں ہے، کیا اس لیے کہ اس لیے کہ وہ حدیث آپ کے مذہب کے مطابق ہے؟ کیا یہی انصاف ہے؟

### میں نے اعلام میں لکھا تھا:

اور حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں مسند احمد کی یہ حدیث ذکر کر کے ابوداؤد کا کلام نقل کیا ہے، اوراس کی موافقت وتائید کی ہے، ان کے الفاظ یہ ہیں **ان ابا داؤد رجح ان ركانة انما طلق إمرأته البتة كما أخرجه هو من طريق اٰل بيته وهو تعليل قوى** یعنی ابوداؤد نے اس بات کو ترجیح دی ہے کہ اس کے سوا کوئی اور بات نہیں ہے کہ رکانہ نے اپنی بی بی کو لفظ بتہ سے طلاق دی جیسا کہ انھوں نے خود رکانہ کے اہل بیت سے روایت کی ہے، اور یہ تعلیل قوی ہے (دیکھو فتح الباری ص )

### صاحب آثار لکھتے ہیں:

یہ غلط ہے کہ ابن حجر نے ابوداؤد کا کلام نقل کر کے اس کی تائید کی ہے، ابوداؤد کی عبارت میں نقل کر چکا ہوں اور فتح الباری کی عبارت مؤلف نے نقل کی ہے ناظرین دونوں کو ملائیں اور دیکھیں کہ مؤلف غلط بیانی میں کس قدر مشاق ہیں (آثار ص۵۲)

**جواب:-** ابن حجر کے نقلِ کلامِ ابوداؤد کا انکار کرنا اوراس کو غلط کہنا غلط بیانی ہے اوراس کا منشا جہالت ہے۔ مجیب صاحب اپنے دماغی خلل کی وجہ سے یہ جانتے ہیں کہ ”کلام“ کا اطلاق صرف

کسی مصنف کی حرف بحرف عبارت پر ہوتا ہے اور بس۔ حالانکہ ہر واقف کار جانتا ہے کہ ''کلام'' کا اسی استعمال میں انحصار نہیں ہے بلکہ کبھی متکلم یا مصنف کی گفتگو یا بحث کے حاصل پر بھی کلام کا اطلاق ہوا کرتا ہے، نیز اعتراض کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے، پس جب ان معانی میں بھی کلام مستعمل ہوتا ہے، تو ناظرین دیکھیں کہ ابن حجر نے ابوداؤد کی بحث کا حاصل لکھ کر اسی موافقت کی ہے یا نہیں۔ اور یہ بھی دیکھیں کہ مجیب صاحب اپنے خصم کو جھوٹا الزام دینے میں کتنے بے باک ہیں۔ علاوہ بریں اگر ابوداؤد کی حرف بحرف عبارت مراد ہو تو بھی میں نے کوئی غلط بیانی نہیں کی اس لیے کہ ابن حجر نے ابوداؤد کی حرف بحرف عبارت بھی نقل کی ہے، ناظرین ابوداؤد ص ۱۱۸ میں ملاحظہ فرمائیں اور دیکھیں کہ ابوداؤد نے جس بات کو ترجیح دی ہے وہ یہ ہے ان رکانة انما طلق إمرأته البتة. اس کے بعد فتح الباری کی منقولہ بالا عبارت کا خط کشیدہ فقرہ پڑھ کر بتائیں، کہ کیا ان دونوں میں ایک حرف کا بھی فرق ہے؟

اصل یہ ہے کہ مجیب نے اولاً تو بدحواسی میں یا بددیانتی سے صرف ایک ہی عبارت ابوداؤد کی اپنے پیش نظر رکھی ہے حالانکہ میں نے ابوداؤد کے دو مقام کا حوالہ دیا ہے۔

دوسرے کسی کا کلام نقل کرنے کا مطلب وہ یہ سمجھتے ہیں کہ شروع سے لے کر اخیر تک حرف بحرف کسی کی عبارت نقل کی گئی ہے تب کہنا چاہئے کہ اس کا کلام نقل کیا ہے، حالانکہ یہ سراسر جہالت ہے۔

اس کے بعد صاحب آثار نے ''علامہ پن'' کا مظاہرہ کرنے کے لیے ایک طویل سلسلۂ گفتگو شروع کر دیا ہے، جس کا حاصل بجز اظہار.... کے اور کچھ نہیں ہے۔

چنانچہ مجیب نے پہلے یہ لکھا ہے کہ ''اگر مؤلف کا یہ مطلب ہے کہ (ابن حجر نے) ابوداؤد کی عبارت کی موافقت کی ہے تو یہ قطعاً غلط ہے'' کوئی ان علامہ سے پوچھے کہ جب آپ اپنی آنکھ سے لکھا ہوا دیکھتے ہیں کہ ''ابن حجر نے ابوداؤد کا کلام نقل کیا ہے اور اس کی موافقت و تائید کی ہے'' تو کلام کے بجائے بار بار عبارت کا لفظ کیوں لکھتے ہیں، اس ابلہ فریبی پر آپ کو کیا چیز مجبور کر رہی ہے۔ علاوہ بریں ابوداؤد کی عبارت کو غلط کہنا بھی جہالت اور اس کی تائید کو مستبعد سمجھنا جہالت بالائے جہالت ہے۔ اور اگر بالفرض اس عبارت میں کوئی غلطی بھی ہو تو اس غلطی کی تائید کا دعویٰ کس نے کیا یا یہ دعویٰ کس طرح لازم آتا ہے، بخاری نے حضرت ام حبیبہؓ کی حدیث روایت کی جس میں ایک صریح غلطی ہے اور اس کو بخاری نے صحیح

میں درج کیا تو کیا اس سے لازم آتا ہے کہ بخاری نے اس صریح غلط بات کی تائیدوموافقت کی، یا یہ لازم آتا ہے کہ اس روایت میں جو صحیح باتیں ہیں ان کی تائیدوموافقت انھوں نے کی ہے۔

اس کے بعد مجیب نے ان تمام باتوں کا خلاصہ درج کیا ہے جو ابن اسحاق کی حدیث کی نسبت فتح الباری میں مذکور ہیں، اس خلاصہ کو لکھ کر اس کے جو نتائج لکھتے ہیں اس کو میں **قولہ اقول** کر کے لکھتا ہوں (**قولہ**) ابن اسحاق کی حدیث ابن حجر کے نزدیک صحیح ہے (**اقول**) میں کہتا ہوں کہ صریح جھوٹ بالکل افترا! فتح الباری کی عبارت لکھو۔ ابن حجر کے نزدیک تو وہ حدیث معلول ہے اور اس کو راوی میں مقال ہے (**قولہ**) کیونکہ ابن حجر ایک احتمالی تاویل کی وجہ سے اس سے استدلال کو موقوف قرار دیتے ہیں (**اقول**) احتمالی وغیر احتمالی تاویل کس کو کہتے ہیں نیز یہ ''کیونکہ'' اور اس کا مطلب جو آگے آتا ہے'' ابن حجر کا فرمایا ہوا ہے یا آپ کا۔ اگر آپ ہی کا ہے تو یہ بھی احتمالی واختراعی وخیالی ہے۔ علاوہ بریں جو تاویل یا تعلیل یا جرح یا تعدیل کوئی محدث کرتا ہے وہ سب احتمالی ہی ہوتی ہے یا آسمان سے نازل شدہ اور وحی کی طرح یقینی، اگر وہ بھی احتمالی ہوتی ہے تو اس پر ایمان لانا کیوں ضروری ہے۔ اور اگر اس پر بھی ایمان لانا ضروری نہیں ہے تو قصہ ہی ختم ہے۔ مجیب کی سمجھ کے قربان جایئے کہ ابن حجر کی تاویل تو احتمالی ہے لیکن مجیب کے زعم فاسد میں جو ابن حجر کے نزدیک ابن اسحاق کی حدیث صحیح ہے، یہ منزل من السماء ہے افسوس ہے اس سمجھ پر۔ (**قولہ**) مطلب یہ ہے کہ یہ تاویل نہ ہوتی تو بے کھٹکے استدلال کرنا صحیح ہوتا (**اقول**) جاہلوں میں اس مطلب فہمی کی قدر ہوگی لیکن علماء تو اس پر نفریں کرتے نظر آئے ہیں (**قولہ**) ترجیح کی جو علت ابوداؤد نے بیان کی ہے ابن حجر نے اس کو نا قابل التفات سمجھا۔ (**اقول**) ناظرین اس بے شرمی و بے حیائی کو ملاحظہ فرمائیں کہ ابن حجر تو صاف صاف ابوداؤد کی ترجیح کو ذکر کر کے اور وجہ ترجیح کی طرف اشارہ کر کے **وھو تعلیل قوی** (یعنی یہ علت نکالنا قوی ہے) لکھتے ہیں اور ابوداؤد کی نکالی ہوئی علت کو قوی فرماتے ہیں، اور مجیب صاحب آنکھ میں خاک جھونک کر یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ ابن حجر نے ابوداؤد کی علت کو نا قابل التفات سمجھا۔ آگے یہ لکھنا کہ چونکہ نفس دعوی میں ابوداؤد کے ہم خیال تھے اس لیے اس دعویٰ کو دوسری دلیل سے مدلل کیا (آثار ص۵۴) اس بات کو صاف واضح کر رہا ہے کہ مجیب نے ابن حجر کی عبارت کا مطلب کچھ بھی نہیں سمجھا۔ اس لیے کہ **وھو تعلیل قوی** کے بعد ابن حجر نے یہ لکھا ہے۔ **لجواز ان یکون بعض رواته حمل البتة علی الثلٰث فقال طلقها ثلاثاً فبهذه النکتة**

**یقف الاستدلال بحدیث ابن عباس**، یعنی یہ تعلیل (علت نکالنا) قوی ہے کیونکہ ممکن ہے کہ بعض راویوں نے **بتہ** کو ثلاث پر محمول کیا ہو اور **طلقھا ثلاثاً** کہہ دیا ہو پس اس نکتہ کی وجہ سے ابن عباس کی حدیث (ابن اسحاق والی حدیث) سے استدلال رک جائے گا۔ ناظرین اس عبارت کو غور سے پڑھیں اور دیکھیں کہ نفس دعویٰ تو **بتہ** کی ترجیح **بمقابلہ ثلاث** ہے اس کی دوسری دلیل ابن حجر نے کہاں ذکر کی ہے۔ ابن حجر نے تو جیسا کہ ہر آنکھ والا دیکھ سکتا ہے ابوداؤد کی نکالی ہوئی علت کے قوی ہونے کی وجہ ذکر کی ہے، اور ابن حجر کے کلام کا مطلب یہ ہے کہ ابوداؤد نے جو علت نکالی ہے وہ درست ہے، کچھ شبہ نہیں کہ جب گھر والے بتہ کے لفظ سے طلاق دینا بیان کرتے ہیں اور باہر کے ایک شخص ثلاثاً کہتے ہیں تو بتہ کو ترجیح دی جائے گی اس لیے کہ یہ گھر والوں کا بیان ہے اور اس تعلیل و ترجیح کو اس بات سے قوت پہنچتی ہے کہ **ثلاث** کے روایت بالمعنی ہونے کا بھی امکان ہے پس ہوسکتا ہے کہ اصل لفظ روایت کا بتہ ہو اور کسی راوی نے بتہ کا معنی ثلاث سمجھ کر بجائے **طلقھا البتہ** کے **طلقھا ثلاثاً** کہہ دیا ہو تو اس نکتہ سے ابن اسحاق کی حدیث سے استدلال رک جائے گا۔ غرضیکہ ابن حجر نے روایت بالمعنی کے امکان سے ابوداؤد کی تعلیل کی تائید و تقویت فرمائی ہے نہ کہ مستقل ایک علت بیان کی ہے اب ہر شخص معلوم کرسکتا ہے کہ مجیب کی بے باکانہ غلط بیانی کی یہ روشن مثال ہے۔ (**قولہ**) یہ علت قوی ان علتوں کے اعتبار سے ہے جن سے قائلین ثلث ابن اسحاق کی روایت کو رد کرنے کی سعی لاحاصل کرتے ہیں۔ (**اقول**) یہ بھی صریح غلط بیانی ہے اگر مجیب صاحب کو اپنی صداقت کا پاس ہے تو ابن حجر کے کسی لفظ سے اس کو ثابت کریں۔

مجیب صاحب اپنا خیال فاسد اس کو شوق سے کہیں لیکن خدا کے لیے ابن حجر پر افترا نہ کریں۔ ناظرین کو میرے بیان سے بخوبی معلوم ہوگیا کہ حافظ نے ابوداؤد کے کلام کی تائید کی ہے۔ باقی مجیب کا یہ لکھنا کہ اگر واقعی حافظ نے ابوداؤد............ کی تائید کی ہے تو ابوداؤد کا کلام بالکل بے معنی اور غلط ہے۔ پس اس کی تائید کو بھی ایسا ہی سمجھنا چاہیے، تو یہ حد درجہ ناسمجھی کی بات ہے اس لیے کہ اولاً ابوداؤد کا کلام بے معنی اور غلط نہیں ہے جیسا کہ بیان کیا جاچکا، اور اگر بفرض محال ان کے کلام میں خود ان سے سہواً یا کسی کاتب سے کوئی لفظ غلط لکھ گیا تو اتنی بات کی وجہ سے ان کے پورے کلام کو بے اعتبار کہہ دینا انتہائی تعصب ہے، علاوہ بریں ابوداؤد کے کلام کا حاصل بالکل واضح اور غلطی سے پاک ہے اور ابن حجر نے اسی کی تائید کی ہے اور بالخصوص جب کہ انھوں نے اس مقام کا ٹکڑا نقل کیا ہے جہاں مجیب بھی کوئی

غلطی نہیں دکھا سکے ہیں، پس ان کی تائید کیوں غلط ہوگی۔ مجیب صاحب یہ علمی میدان ہے جہلا کی پنچایت نہیں کہ ایک لایعنی بکواس سے سننے والوں کو مرعوب کرنے کی کوشش کیجئے۔

اس کے بعد صاحب آثار نے حافظ ابن حجر کی اس بات کا کہ ثلاثاً ممکن ہے کہ روایت بالمعنی ہو، یہ جواب دیا ہے کہ امام احمد کے ارشاد کے مطابق اہل مدینہ طلاق ثلاثہ کو بتہ کہتے ہیں پس بتہ والی روایت برتقدیر صحت روایت بالمعنی ہوگی نہ ثلاثاً کی روایت۔ اور نہایہ میں ہے **ومنه الحديث طلقها ثلاثاً بتة** اس سے ثابت ہوتا ہے کہ طلاق ثلاثہ کو بتہ کہتے تھے نہ بتہ کے معنی ثلاث کے ہیں کیونکہ اس حدیث میں ثلاث کی تفسیر بتہ کے ساتھ کی گئی ہے (آثار ص ۵۶ مختصرا) میں افسوس کے ساتھ کہتا ہوں کہ اگر مجیب صاحب پڑھانے میں بھی اپنی اسی اعلیٰ قابلیت اور بے مثال دیانت کا اظہار کرتے ہوں گے تو بس اللہ ہی حافظ ہے۔ ناظرین دیکھیں کہ جب امام احمد کا ارشاد مجیب یہ بتاتے ہیں کہ اہل مدینہ طلاق ثلٰثہ کو بتہ کہتے ہیں یعنی مدینہ کے محاورہ میں بتہ کے معنی تین طلاق کے ہیں۔ تو اس سے ابن حجر کے کلام کی تو اور تائید ہوتی ہے نہ تردید۔ اس لیے کہ ابن حجر بھی تو یہی فرماتے ہیں کہ بعض راویوں نے بتہ کو ثلٰث پر محمول کیا یعنی چونکہ اہل مدینہ کے محاورہ میں بتہ بمعنی ثلٰث ہوتا ہے اس لیے رکانہ کی حدیث میں بتہ کے لفظ کو کسی نے ثلاثاً کے معنی میں سمجھ کر ثلاثاً ہی روایت کر دیا۔ چنانچہ اسی بات کو امام بخاری نے اور بقول مجیب حافظ منذری نے **وان الثلث ذكرت فيه على المعنى** میں بیان کیا ہے۔ مجیب صاحب امام احمد کی عبارت میں غور کریں **يسمون من طلق إمرأته ثلاثاً البتة** میں گویا تصریح ہے کہ البتۃ اسم یعنی لفظ اور ثلاثاً مسمی یعنی معنی ہے اب ابن حجر کی عبارت **حمل البتة على الثلٰث** اور امام بخاری کے فقرہ **ان الثلٰث ذكرت فيه على المعنى** کو دیکھیں کہ کس طرح امام احمد کا قول ان دونوں کی تائید کر رہا ہے۔ علاوہ بریں مجیب اس پر بھی غور کریں کہ حدیث ابن عباس اور حدیث رکانہ میں سے کس کے رواۃ مدنی اور کس کے غیر مدنی ہیں اور کون ثلاثاً کہتا ہے اور کون بتہ، ملاحظہ ہو۔

| حدیث ابن عباس کے راوی ابن اسحاق اور داؤد مدنی ہیں اور ثلاثاً روایت کرتے ہیں۔ | حدیث رکانہ کے راوی نافع بن عجیر، علی بن یزید، عبداللہ، علی بن السائب، زبیر بن سعید، محمد بن شافع وغیرہم یہ سب غیر مدنی ہیں۔ اور بتہ روایت کرتے ہیں۔ |
| --- | --- |

(جاری ہے)

# صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی عدالت وراستی کے دلائل کتاب وسنت سے

تحریر: دکتور محمد بن عبداللہ الوھیبی (چوتھی قسط) ترجمہ: مولانا ازہر رشید الاعظمی

## ایک نظر موضوعی طریقۂ کار پر

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام پر اس منہج اور طریقۂ کار کی خرابی اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی تاریخ پر اس کی تطبیق کے نتیجے میں پیدا ہونے والی سنگینی کا بھی جائزہ لے لیا جائے۔

موضوعی منہج اور طریقہ کے معنی اہل مغرب کے نزدیک یہ ہیں کہ مسائل وموضوعات کی تحقیق اور چھان بین محض عقلی اعتبار سے ہو، اوراس میں دینی اور مذہبی افکار ونظریات کا کوئی دخل نہ ہو[1]۔

ہم اس کے جواب میں کچھ عرض کرنا چاہیں گے:

**اولاً**: یہ کہ کسی مسلمان کا کسی بھی حالت میں اپنے عقیدہ سے دستبردار ہونا ممکن نہیں، الا یہ کہ وہ مرتد ہوجائے۔

**ثانیاً**: یہی بات اسلامی تاریخ کے حوالے سے کہی جاسکتی ہے کہ جب تاریخی واقعات روایتوں کی پرکھ اور چھان بین کی کسوٹی سے گزر کر پایۂ ثبوت تک پہنچ جائیں، تو ہم کون سا طریقہ ان کے سمجھنے اوران کی وضاحت کے سلسلہ میں اختیار کریں؟ اگر ہم ان کی تفہیم وتشریح اسلامی منہج کی روشنی میں نہ کریں تو ہم کو لازمی طور پر کوئی دوسرا طریقہ اختیار کرنا پڑے گا اوراس صورت میں ہم غیر شعوری طور پر اسلامی منہج سے منحرف اور دور ہوتے چلے جائیں گے۔

بنابریں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی تاریخ کی تحقیق میں اس طریقۂ کار پر عمل درآمد سے ہمارا بچنا اور دور رہنا اشد ضروری ہے، اور ہمیں یہ بھی جان لینا ضروری ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی تاریخ کی تحقیق سے متعلق جس چیز کو علمی تنقید یا موضوعیت (عقلیت پسندی) کا نام دیا جاتا ہے، وہ وہی سبّ وشتم ہے جو اہل

---

(۱) دیکھئے: منهج كتابة التاريخ للعلياني: ۱۳۸

بدعت اور تاریخ کی کتابوں میں پائی جاتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ صرف علمی منہج کے نام سے موسوم کر دینے سے اس کی وہ حقیقت نہیں بدل سکتی جو علماء اہل سنت کے نزدیک معروف ومشہور ہے، نہ یہ نام اس کی قدر وقیمت میں کچھ اضافہ کر سکتا ہے؛ جس طرح اس کا وزن اس سے بھی نہیں بڑھ سکتا کہ اس کا ذکر مشہور مصنفین -جن میں کچھ اچھے لوگ بھی ہیں- بار بار کرتے رہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان متاخرین نے صرف یہ کام کیا ہے کہ اس سبّ وشتم کو زندہ کر دیا ہے جسے اہل سنت نے اپنے دور حکومت میں دفن کر دیا تھا(۱)۔

میں اپنے آپ کو اور اپنے ان بھائیوں کو جو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی تاریخ میں غور وفکر اور اس کی تحقیق کرتے ہیں، یہ نصیحت کرتا ہوں کہ وہ اپنے عقیدہ سے دستبردار نہ ہوں، اور من جملہ ان عقائد کے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی عدالت وراست بازی اور ان کی تاریخ کی چھان بین کے وقت ان کی شان میں گستاخی کے حرام ہونے کا اعتقاد بھی ہے؛ اس لیے محققین کو اللہ سے ڈرنا چاہئے کہ کہیں ان کی طرف سے اسلام پر حملہ نہ ہو، اور انھیں معلوم ہونا چاہئے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے واقعات سے متعلق غور وفکر کے سلسلے میں اہل سنت کا ایک واضح منہج اور طریقۂ کار ہے، جس کا ذکر کتاب کے آخر میں آئے گا۔

پانچویں قسم: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی شان میں بیہودہ گوئی کا حکم:

جو شخص ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر اس گناہ کی تہمت لگائے، جس سے اللہ تعالی نے قرآن پاک میں ان کی براءت وپاک دامنی کا اعلان کر دیا ہے، تو تمام اہل علم کا اس کے کافر ہونے پر اتفاق ہے۔

قاضی ابویعلی نے کہا ہے: 'جو شخص حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو اس گناہ سے متہم کرے جس سے ان کی براءت کا اللہ تعالی نے اعلان کر دیا ہے، تو بالاجماع اس کو کافر قرار دیا جائے گا' اور ایسے شخص کی تکفیر پر علماء کے اجماع کا ذکر قاضی صاحب کے علاوہ دوسرے بہت سے علماء نے بھی کیا ہے، اور بہت سے ائمہ نے اس حکم کی تصریح کی ہے، چنانچہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے: 'جو شخص حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو برا بھلا کہتا ہے اسے کوڑے لگائے جائیں گے، اور جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی شان میں بدزبانی کرے اسے قتل کر دیا جائے گا' آپ سے اس فرق کی وجہ دریافت کی گئی، تو فرمایا کہ: 'جو

---

(۱) یہ فقرہ ڈاکٹر محمد رشاد خلیل کے اس مضمون سے ماخوذ ہے، جس میں ڈاکٹر صاحب نے مذہب اہل سنت کے لحاظ سے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی تاریخ میں غور وفکر کے صحیح منہج کو اجاگر کیا ہے، فجزاہ اللہ خیراً۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگاتا ہے وہ قرآن کی مخالفت کرتا ہے‘[۱]۔

اور ابن شعبان کی روایت میں حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل ان الفاظ میں ذکر کی گئی ہے: ’اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿يَعِظُكُمُ اللّٰهُ اَنْ تَعُوْدُوْا لِمِثْلِهٖٓ اَبَدًا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ [۲] (ترجمہ: اللہ تعالیٰ تمھیں نصیحت کرتا ہے کہ پھر اس قسم کی حرکت کبھی نہ کرنا اگر تم ایمان والے ہو) تو جو شخص پھر وہی حرکت کرے گا وہ یقیناً کافر ہوگا‘[۳]۔

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت طرازی کے کفر ہونے کی بہت سی واضح اور صریح دلیلیں موجود ہیں، جن میں سے بعض یہ ہیں:

۱:- پہلی دلیل تو یہی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مذکورہ آیت سے استدلال ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت تراشی قرآن کریم کی اُس شہادت کی تکذیب ہے، جو اس نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی براءت و پاک دامنی کی دی ہے، اور قرآن کی کسی بات کی تکذیب و تردید کفر ہے۔

امام ابن کثیر نے لکھا ہے: ’تمام علماء کرام رحمہم اللہ کا اس بات پر اجماع ہے کہ جو شخص اس آیت کریمہ میں مذکورہ شہادت کے بعد بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر لعن طعن کرے گا اور آپ پر تہمت لگائے گا، تو وہ یقیناً کافر ہوگا، اس لیے کہ وہ قرآن کا مخالف ہے‘[۴]۔

اور ابن حزم، امام مالک کے سابق قول پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں: ’امام مالک کی یہ بات بالکل صحیح ہے، اس لیے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت تراشی کھلا ہوا ارتداد اور اللہ کے اس قطعی فرمان اور شہادت کی تکذیب ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان کی برأت و پاک دامنی کی دی ہے‘[۵]۔

۲:- دوسری دلیل یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت تراشی مختلف وجوہ سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذا رسانی اور آپ کی شان میں گستاخی کا سبب بنتی ہے، وہ وجوہ خود قرآن کریم میں مذکور ہیں۔

منجملہ ان وجوہ کے ایک وجہ یہ ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ ان دونوں آیتوں: ﴿وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ﴾ [۶] (ترجمہ: اور جو لوگ تہمت

---

(۱) الصارم المسلول: ۵۶۵-۵۶۶، یہ روایت محلی (۴۱۴/۱۱-۴۱۵) میں سند کے ساتھ مذکور ہے۔
(۲) سورۃ النور: ۱۷ (۳) الشفا: ۱۱۰۹/۲
(۴) دیکھئے تفسیر ابن کثیر: ۲۷۶/۲ تفسیر آیت ﴿إِنَّ الَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنَاتِ﴾ سورۂ نور: ۲۳۔ اس پر اجماع کا ذکر انھوں نے البداية والنهاية: ۹۵/۸ مطبوعہ دار الکتب العلمیہ میں بھی کیا ہے۔
(۵) محلّی: ۴۱۵/۱۱ (۶) سورۃ النور: ۴

لگائیں پاک دامن عورتوں کو، اور پھر چار گواہ نہ لاسکیں) اور ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ الْغٰفِلٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ﴾(۱) (ترجمہ: جو لوگ تہمت لگاتے ہیں ان (بیویوں) کو جو پاک دامن ہیں بے خبر ہیں ایمان والیاں ہیں) کے درمیان فرق کرتے ہیں اور دوسری آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ یہ آیت خاص طور سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری ازواج مطہرات سے متعلق ہے، اور یہ آیت مبہم ہے جس میں توبہ کا کوئی ذکر نہیں ہے، جبکہ کسی عام مسلمان عورت پر تہمت لگانے والے کے لیے اللہ تعالی نے توبہ کا ذکر کرتے ہوئے اس کا دروازہ کھلا رکھا ہے۔ راوی کا بیان ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی اس عمدہ تفسیر کو سن کر حاضرین مجلس میں سے ایک شخص نے چاہا کہ اٹھ کر آپ کی پیشانی کو چوم لے(۲)۔

الغرض حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ وضاحت فرمادی کہ یہ آیت انھیں لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور دوسری امہات مومنین رضی اللہ عنہن پر تہمت لگانے والے ہیں، اس لیے کہ ازواج مطہرات پر تہمت لگانا خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو مجروح اور داغدار کرنا ہے؛ کیونکہ کسی عورت پر تہمت تراشی جس طرح اس کی اولاد کی ایذارسانی کا باعث ہے، اسی طرح اس کے شوہر کی بھی ایذارسانی کا سبب بنتی ہے؛ اس وجہ سے کہ بیوی پر زنا کی تہمت شوہر کا بے حیا اور بے غیرت ہونا ظاہر کرتی ہے، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ بیوی کی بدکاری شوہر کے لئے سخت اور شدید اذیت کا سبب بنتی ہے، بلکہ بعض لوگوں کو اپنے اہل خانہ پر تہمت تراشی کے نتیجے میں جس ذلت ورسوائی کا سامنا کرنا پڑتا ہے، وہ اس سے کہیں زیادہ سنگین ہوتی ہے جو خود ان پر تہمت لگائے جانے کے نتیجے میں حاصل ہوتی (۳)۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذارسانی بالاجماع کفر ہے۔

علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ ارشاد باری تعالی: ﴿یَعِظُكُمُ اللّٰهُ اَنْ تَعُوْدُوْا لِمِثْلِهٖۤ اَبَدًا﴾ (ترجمہ: اللہ تمھیں نصیحت کرتا ہے کہ پھر اس قسم کی حرکت کبھی نہ کرنا) کی تفسیر میں کہتے ہیں: 'یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں، اس لیے کہ اس جیسی حرکت اسی وقت متحقق ہوسکتی ہے جب کہ وہی الزام بعینہ اسی شخص پر یا اس کے ہم مرتبہ شخص پر لگایا جائے، یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن پر، اور اس حرکت کی ممانعت اُس اذیت وتکلیف کے پیش نظر کی گئی جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی اور اپنے اہل خانہ کی آبرو

(۱) سورۃ النور: ۲۳ (۲) تفسیر ابن جریر: ۸۳/۱۸، وابن کثیر: ۲۷۷/۳
(۳) الصارم المسلول: ۴۵، والقرطبي: ۱۳۹/۱۲، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ

کے سلسلے میں پہنچتی ہے، اور آپ ﷺ کو ایسی اذیت اور تکلیف پہنچانا کفر ہے'(۱)۔

ازواج مطہرات پر تہمت تراشی کی وجہ سے رسول اکرم ﷺ کو اذیت و تکلیف پہنچنے کی ایک دلیل حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی وہ حدیث بھی ہے جس میں آپؓ نے واقعۂ افک (اپنے اوپر لگائی جانے والی تہمت) کو بیان کیا ہے، جسے امام بخاری و مسلم رحمہما اللہ نے اپنی اپنی کتابوں میں ذکر کیا ہے، فرماتی ہیں کہ: 'رسول اللہ ﷺ نے منبر پر کھڑے ہو کر عبداللہ بن اُبی بن سلول کے سلسلے میں ارشاد فرمایا کہ لوگو! مجھے اس شخص سے کون انصاف دلائے گا اور انصاف خواہی کے سلسلے میں مجھے معذور سمجھے گا، جس شخص کی ایذا رسانی میرے اہل خانہ تک پہنچ گئی ہے۔

اس حدیث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آپ ﷺ کو اس واقعہ سے اس قدر تکلیف پہنچی کہ آپ ﷺ نے عذر خواہی کرتے ہوئے لوگوں سے مدد کی خواہش کا اظہار فرمایا، اور بعض صحابہؓ نے عرض کیا کہ آپ ہمیں اس کی گردن اڑانے کا حکم دیں، ہم آپ کو معذور سمجھیں گے اگر آپ اس کے قتل کا حکم دیں گے؛ چنانچہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے جب آپ ﷺ سے اس کی گردن مارنے کا حکم لینا چاہا تو آپ ﷺ نے اسے ناپسند نہیں فرمایا(۲)۔

شیخ محمد بن عبدالوہاب فرماتے ہیں: 'جو شخص طیبہ وطاہرہ ام المومنین اور پیغمبر خدا ﷺ کی دنیا وآخرت کی زوجۂ مطہرہ پر تہمت لگاتا ہے، وہ منافقوں کے سردار عبداللہ بن ابی بن سلول کے قبیل سے ہے؛ جس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ زبان حال سے یہ فرما رہے ہیں: اے مسلمانوں کی جماعت! مجھے ان لوگوں کے بارے میں کون معذور سمجھے گا جنھوں نے مجھے میرے گھر والوں کے سلسلہ میں اذیت اور تکلیف پہنچائی ہے۔ ﴿إِنَّ الَّذِينَ يُؤْذُونَ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَاَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِينًا وَالَّذِينَ يُؤْذُونَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنٰتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوا فَقَدِ احْتَمَلُوا بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِينًا﴾ (۳) (ترجمہ: بے شک جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کو ایذاء پہنچاتے رہتے ہیں ان پر اللہ لعنت کرتا ہے دنیا اور آخرت میں اور ان کے لئے عذاب ذلیل کرنے والا تیار کر رکھا ہے۔ اور جو لوگ ایذاء پہنچاتے رہتے ہیں ایمان والوں کو اور ایمان والیوں کو بدون اس کے کہ انھوں نے کچھ کیا ہو، تو وہ لوگ بہتان اور صریح گناہ کا بار (اپنے اوپر) لیتے ہیں) کہاں ہیں دین و مذہب کے انصار و مددگار جو آپ

---

(۱) قرطبی: ۱۲/۱۳۶، ۱۳۷، بحوالہ احکام القرآن: ۳/۱۳۵۵، ۱۳۵۶، تحقیق: البجاوی

(۲) الصارم المسلول: ۴۷-۴۹ مختصراً (۳) سورۃ الأحزاب: ۵۷-۵۸

ﷺ کو یہ جواب دیں کہ حضور ہم آپ کو معذور سمجھ کر آپ کی مدد کریں گے(۱)۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر افترا پردازی وطعنہ زنی سے آپ ﷺ کی تنقیص ایک اور پہلو سے بھی ثابت ہوتی ہے، اللہ رب العزت کا ارشاد ہے: ﴿اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ﴾(۲) (ترجمہ: گندی عورتیں گندے مردوں ہی کے لائق ہوتی ہیں)۔

علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: 'یعنی اگر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پاکیزہ نہ ہوتیں تو اللہ تعالی انھیں آپ ﷺ کی بیوی نہ بناتے؛ اس لیے کہ آپ ﷺ تو تمام پاکیزہ انسانوں سے بڑھ کر پاک وصاف ہیں، اگر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پاکیزہ نہ ہوتیں تو وہ آپ ﷺ کے لائق نہ تو شرعی لحاظ سے ہوتیں نہ ہی قدرتی اعتبار سے۔ اسی لیے اللہ تعالی فرماتے ہیں: ﴿أُولٰئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ﴾ یعنی یہ لوگ الزام تراشوں کی الزام تراشی اور ظلم وزیادتی کرنے والوں کی باتوں سے بہت دور ہیں'(۳)۔

### چھٹی قسم: بقیہ امہات المومنین کو برا بھلا کہنے کا حکم:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے علاوہ دوسری امہات المومنین پر تہمت تراشی کے باب میں علماء کا اختلاف ہے۔ اکثر علماء کے نزدیک راجح بات یہ ہے کہ ایسا کرنے والا کافر ہے؛ اس لیے کہ تہمت لگائی جانے والی ہستی آپ ﷺ کی زوجۂ محترمہ ہیں، اور حضرت عائشہؓ پر تہمت سے اللہ تعالی کی شدید ناراضگی کا سبب ہی یہ ہے کہ یہ تہمت آپؐ کی زوجۂ مطہرہ پر ہے، لہذا وہ اور ان کے سوا آپ ﷺ کی دوسری بیویاں اس حکم میں برابر ہوں گی(۴)۔

اور اس لیے بھی کہ آپ ﷺ کی کسی بیوی پر تہمت تراشی آپ ﷺ کی ایذا رسانی اور تنقیص کا باعث ہوگی(۵)۔

اور ہم اس کو ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگانے والوں کے حکم سے متعلق گفتگو کرتے وقت بیان کر چکے ہیں۔ ہاں اگر امہات المومنین کی طعن وتشنیع اس تہمت کے علاوہ کسی اور طریقہ سے کی گئی ہو تو اس کا حکم وہی ہوگا جو گذشتہ تفصیلات کے مطابق دوسرے تمام صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی طعن وتشنیع کا ہے۔

(جاری ہے)

---

(۱) رسالة في الرد على الرافضة: ٢٥-٢٦

(۲) سورة النور: ٢٦ (۳) ابن کثیر: ٢٧٨/٣

(۴) البدایہ والنھایہ: ٩٥/٨ (۵) الشفا: ١١١٣/٢، صواعق محرقہ: ٣٨٧، محلّی: ٤١٥/١١

اعیان الحجاج سے ماخوذ

# مشاہیر کرام کے واقعات حج

از: محدث جلیل ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ

## چودھویں صدی

**مولوی محمد لطیف مچھلی شہری** گورکھپور میں وکیل تھے، ۱۳۰۸ھ میں مولوی وزیر علی خاں گورکھپوری کی معیت میں حج کو گئے، اور سفر نامہ حج لکھا، اس وقت اکبر، حسینی جیسی نامی جہاز تھے انھوں نے تن جور جہاز سے سفر کیا، سیلون کا کرایہ =/۶۵ روپے سے =/۵۰ روپے تک، اور تتق کا بھی =/۵۰ روپے تھا، مولانا عبدالحق الہ آبادی مہاجر سے دلائل الخیرات کی سند لی۔

مکہ ومدینہ کی درمیانی منازل کی تفصیل یوں دی ہے

(۱۳۰۹ھ) ۵محرم کو روانگی مکہ معظّمہ سے ۶رمحرم کو مقام شہداء سے جو دوکوس پر ہے اور وہاں سے مرقد میمونہ سرف ۴-۵ کوس ہے، ۷ کو وادی فاطمہ سے چلے، یہاں سے ۱۶ر یا ۱۸رکوس پر مقام اصفہان (عسفان) ہے، وہاں سے ۸رمحرم کو، پھر خلیف (خلیص) سے ۹رمحرم کو، اور قضیمہ سے ۱۰ محرم، اور رابغ سے ۱۲رمحرم کو چلے، اس کے بعد بیر رضوان ملا، ۱۵رمحرم کو ابواضداء سے چلے پھر قیف (خیف) ملا، ۱۶رمحرم کو ریان سے چلے تو رباط ملا ۱۸رکو بیر الماشی سے تو مدینہ منورہ پہنچے، واپسی میں بیر ماشی، بیر الاردب، ریان، ابواضداء بیر رضوان، رابق، قدیمہ، خلیف، اصفہان[1]، وادی فاطمہ سے گزر ہوا۔

**علیم اللہ مرحوم جدہ** انھوں نے رسالۂ حج میں لکھا ہے کہ ۱۳۰۹ھ اور ۱۳۱۰ھ میں تین کمپٹیاں جہاز کی تھیں ایک مسرس طامس کوک اینڈ سن کی، یہ سب سے اچھی تھی، دوسری حاجی قاسم یوسف میمن کی، ان کے پاس ایک دو جہاز تھے، تیسری حاجی عبدالحسین شیرازی کی، جہاز کا کرایہ ایک طرف کا فرسٹ کلاس کا ساٹھ روپے سے ستر تک، چھتری کا پینتیس سے ۴۵ روپے تک............اور ایک طرف کا سیلون کا

(۱) رابغ، قضیمہ، خلیص، عسفان،

۴۰ر سے ۵۰ روپے تک، ڈیک کا ۲۵-۳۵ روپے تک، ۳۰ برس پہلے بادبانی جہاز یلملم پر کھڑے ہوتے تھے وہاں مکہ براہ خشکی دو دن کی راہ ہے، مدینہ منورہ کے راستہ میں حسب ذیل مسجدیں ملتی ہیں۔

مسجد عائشہ (تنعیم) مسجد سرف، مسجد مرالظہران، مسجد خلیص، مسجد عقبہ، مسجد جحفہ، مسجد بدر، مسجد صفرا وادی، مسجد الخزاتہ، مسجد صغیر روما (روحا)، مسجد عرق الظبیۃ، مسجد معرس، مسجد ذوالحلیفہ

**مرزا عرفان علی بیگ گونڈوی** | ۱۳۱۱ھ (۱۸۹۴ء) میں ۲ر شوال کو گونڈہ سے روانہ ہوئے، ۳ر کو لکھنؤ پہنچے، وہاں سے براہ بھوپال بمبئی روانہ ہوئے، ۵ر کو بمبئی پہنچے، بمبئی اینڈ پرشیا اسٹیم نیویگیشن کے حسینی جہاز کا ٹکٹ لیا، ۱۰ر شوال کو جہاز نے لنگر اٹھایا، اپریل کے مہینہ میں بھی تلاطم اور طبیعت میں بدمزگی تھی، ۱۲ر شوال کی شام کو جہاز کراچی پہنچا، ۱۳ر کی شام کو روانہ ہوا، جہاز میں اتنی جنبش تھی کہ کچھ سامان نذر دریا ہو گیا، اس میں ۲۵ ۷ مسافر تھے، کراچی سے عدن ۱۴۶۰ میل ہے، اسٹیمر کی رفتار فی گھنٹہ ۹½ میل تھی، ۲۰ر شوال ۴ بجے صبح کو عدن پہنچے، ۲ بجے دن کو روانہ ہوئے، ۲۱ر شوال ۵ بجے شام کو کامران پہنچے، یہاں قرنطینہ اور پانی کی کمی کی وجہ سے بڑی تکلیف رہی کامران میں کپڑا بناتے ہیں ۳ر سال پہلے پورا جہاز ''نادری'' کامران سے بوجہ ہیضہ واپس کر دیا گیا، اس میں ۷۰۰ سو مسافر تھے ہم کو تجور نامی جہاز کامران میں ملا۔ مُلا احمد خاں پشاوری کامران میں ملے ۴ر ذی قعدہ کو کامران اور قرنطینہ سے نجات ملی، ۶ر ذیقعدہ کو بعد دوپہر جدہ پہنچے۔

لونڈی، غلاموں کی فروخت جاری ہے، شریف عون الرفیق کا زمانہ ہے، راتب پاشا کی معزولی کا پروانہ آیا، اور حسن پاشا حلمی کا تقرر بعنوان حکومت حجاز ہوا۔ تبت جہاز میں واپسی ہوئی اس میں ۱۳ر سو مسافر تھے، ۵ر محرم ۱۳۱۲ھ کو گونڈہ واپس آئے، ایک اسٹیمر عبدالقادر نام کا تھا، عدن پر انگریز کا قبضہ ۱۸۳۹ء میں ہوا۔

**کرنل شاہ بیگ خاں** | ہند میں افغانستان کے سفیر تھے ۱۳۲۰ھ میں شملہ نامی جہاز پر بمبئی سے اور شاہ نور نامی جہاز سے واپس ہوئے، جدہ سے ینبع پانی کے جہاز میں اور وہاں سے اونٹ پر مدینہ گئے، ۱۷ر صفر ۱۳۲۱ھ کو واپسی ہوئی۔

۱۳۲۲ھ[1] میں کراچی سے بوریستن نامی جہاز سے ۱۴۰ روپیہ کرایہ ادا کر کے فرسٹ کلاس سے

(۱) کرنل شاہ بیگ کے ذکر کے بعد یہ سطریں میری نوٹ بک میں تھیں، اغلب یہ ہے کہ یہ بھی انھیں کا ذکر ہے۔

سویز روانہ ہوئے، تھرڈ کلاس کا کرایہ/۷۰ روپے تھا، ۲۹/شوال کو ۹ بجے کراچی سے چلے ۱۱/ذیقعدہ کو سویز پہنچے ۲۳/ذیقعدہ کو سویز سے ایک روسی جہاز میں سوار ہوئے، اس میں ۱۴۴۰ مسافر تھے، ۲/ذی الحجہ کو جدہ پہنچے، شریف عون بن محمد بن عون کا طائف میں انتقال ہوا۔ جمادی الاولی ۱۳۲۳ھ میں شریف علی بن شریف عبداللہ قائم مقام ہوئے پھر وہی مستقل ہوئے یکم رجب ۱۳۲۳ھ کو عبدالحمید خاں والی ترکی کا جشن تاجپوشی منایا گیا، احمد راتب پاشا والی مکہ مقرر ہوئے ۱۳۲۳ھ میں بھی حج کیا، منصوری جہاز میں واپسی ہوئی ۲۳/ربیع الاول ۱۳۲۴ھ کو بمبئی واپس ہوئے۔

**استاذ مرحوم حضرت مولانا عبدالغفار مئوی** | مولانا نے ۱۳۲۱ھ میں حج کیا، اوراسی سال محرم ۱۳۲۱ھ میں رسالہ حج مسمی ''مسلک البررۃ'' تالیف فرمایا، اس کی ضخامت ایک سو چھ صفحات ہے، مناسک حج کے بیان میں یہ بہترین رسالہ ہے، حیرت ہے کہ مولانا نے یہ رسالہ حج سے پہلے لکھا ہے مگر مواقیت، ومقامات متبرکہ، اور مساجد ومشاہد کا بیان پڑھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ آنکھوں دیکھا حال بیان کررہے ہیں، جمعہ کے دن ۲۱/محرم ۱۳۲۲ھ کو مولانا مئو واپس ہوئے تو معلوم ہوا کہ اس سال طاعون میں چار ہزار سے زائد آدمی مئو میں اوراسی قدر مبارک پور میں مرے، اس سے متاثر ہوکر آپ نے رسالہ ''کشف المکنون عما یتعلق بالخروج علاجاً وفراراً من الطاعون'' لکھا۔ آپ حضرت گنگوہی کے ارشد تلامذہ میں تھے، آپ کے تلامذہ میں مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند تھے، ناچیز کو بھی آپ ہی کی خدمت میں کچھ شُد بد حاصل ہوئی ہے، آپ کی وفات ۱۳۵۱ھ میں ہوئی، عیدگاہ اورنگ آباد (مئو) کے جانبِ جنوب نیا پورہ جانے والے راستہ کے بالکل قریب مزار ہے، رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔

**مولانا محی الدین حسین مدراسی** | مدرسہ لطیفیہ ویلور (مدراس) میں صدر مدرس تھے آپ نے ۱۳۲۲ھ میں حج کیا اور ایک سفر نامہ لکھا جس کا نام ''سفر نامۂ حرمین شریفین'' ہے، اس وقت مکہ معظّمہ میں شیخ العلماء محمد سعید بابصیل محدث، شیخ شعیب مغربی، شیخ عمر شامی، شیخ حسب اللہ مکی (محلّہ خندریسہ متصل صولتیہ میں) ابوالخیر مراد شیخ الائمہ، شیخ اسعد دہان، عبدالرحمٰن دہان، مولانا عبدالحق الہ آبادی، اور شیخ محمد رئیس بقید حیات تھے۔

اور مدینہ منورہ میں شیخ امین رضوان، سید احمد برزنجی، شیخ عبداللہ نابلسی، شیخ مامون بری، عمر

بن ہمدان (حمدان) تونسی، شیخ یاسین مصری، شیخ خلیل خربوطی، عبدالقادر طرابلسی، شیخ موسیٰ مالکی اصحاب درس تھے۔

ینبع سے بیر سعید، حمراء (جدیدہ) بیر عباس، بیر درویش میں منزل کرتے ہوئے مدینہ پہنچے، واپسی کا راستہ یہ تھا۔ مدینہ سے بیر ماشی ۸ گھنٹہ میں غائر، بیر حسانی، بیر شیخ، بیر مستورہ، رابغ، شداج، تینا بیک، ذہبان، جدہ۔

**مولانا محمد اسلم فرنگی محلی** ۱۳۲۲ھ میں مولانا محمد اسلم فرنگی محلی نے بھی حج کیا اور شیخ عبدالحق الہ آبادی مہاجر، شیخ صالح کمال مفتی حنفیہ، شیخ حسین حبشی، شیخ ابوالخیر بن عبداللہ میرداد (غالباً انھیں کو مولانا محی الدین نے ابوالخیر مراد لکھ دیا ہے) شیخ محمد سعید بابصیل سے مکہ میں، اور شیخ امین رضوان، شیخ مصطفیٰ حبشی، خلیل خربوطی، شیخ جزری، شیخ حضرمی سے مدینہ منورہ میں اجازات حاصل کیں، مولانا محمد اسلم صاحب کو میں نے لکھنؤ میں دیکھا تھا ان کے صاحب زادے مولوی ناصر میرے پاس آتے جاتے تھے۔

**خطیب قادر بادشاہ** وانمباڑی کے رہنے والے تھے، ذی الحجہ ۱۳۲۲ھ (فروری ۱۹۰۷ء) میں حج کیا، اور سفر حجاز کے نام سے واقعاتِ سفرِ حج لکھے، فرماتے ہیں۔

بمبئی سے عدن ۱۶۶۴ میل، عدن سے جدہ ۱۲۰۰ میل ہے، بوہرہ کمپنی کے جہاز کردمنڈل (جس کا نام بعد میں شاہ نور ہو گیا) سے سفر کیا، سکنڈ کلاس کرایہ ایک طرف کا =/۵۷ روپے اور تھرڈ کلاس کا =/۴۰ روپے تھا، بعد میں دس پندرہ روپے میں ٹکٹ ملنے لگا، مولوی صبغۃ اللہ ہم سفر تھے۔

تنعیم، مکہ سے تین میل پر ہے، شریف علی کی حکومت ہے، احمد راتب پاشا والی مکہ ہیں شیخ شعیب مراکو کے رہنے والے مالکی المذہب ہیں، ان کا حلقۂ درس سب سے بڑا ہے، بخاری پڑھاتے ہیں، سلطنت عثمانیہ (ٹرکی) سے تنخواہ پاتے ہیں، مشہور اساتذہ مکہ سے ہیں۔ مولانا عبدالحق الہ آبادی چالیس سال سے یہاں ہیں، صاحبِ کمال اور مقبول ومحبوب ہیں، ان سے دلائل الخیرات وغیرہ کی سند لی۔

اسی سال نواب بھاولپور نے ۵۰۰ آدمیوں کے ساتھ ایک خاص جہاز کا انتظام کر کے حج کیا، حاجی عبدالرحمٰن عنبر خانی مقیم مدینہ نے بھی حج کیا، جنوبی آرکاٹ کے رہنے والے اور ہر دلعزیز ہیں، ان کا ذکر سفرنامہ حرمین میں مولانا محی الدین نے بھی کیا ہے، مکہ سے مدینہ پھر وہاں سے جدہ کا کرایہ ۵۵ مجیدی (ایک مجیدی ۲/۵۰ کی) مکہ سے عرفات ۹ میل کرایہ ۳۲/۵۰ (آمد و رفت کا ہوگا) مکہ سے جدہ

۳۰میل کرایہ ۳۲/۵۰حج وزیارت سے فارغ ہونے کے بعد نواب بھاولپور بیمار ہوئے، اور عدن پہنچ کر انتقال کر گئے، نعش بھاولپور لائی گئی۔

جدہ سے مشتری نامی جہاز سے جو مغل کمپنی کا تھا، ینبوع (ینبع) آئے، ینبوع (ینبع) جدہ سے ۱۶۰میل ہے، عثمان پاشا والی مدینہ ہے جو محافظ مدینہ کہلاتا ہے، ریلوے لائن دمشق سے مدائن صالح تک مکمل ہوگئی، مدائن صالح مدینہ سے ۱۵۰کلومیٹر ہے۔ مدینہ منورہ میں شیخ عباس رضوان سے دلائل الخیرات وقصیدہ بردہ کی سند لی، مدینہ ورابغ کے درمیان منازل کے نام یہ ہیں۔ بیر عار، بیر خلص، بیر بن حسانی، بیر شیخ، مستورہ، رابغ۔

**مولانا ابوالحسن عراقی مئوی** مولانا میرے استاذ محترم تھے، میں نے مولانا کے پاس کافیہ وشرح جامی وغیرہ متعدد کتابیں پڑھی ہیں، خط کی مشق بھی آپ ہی کے پاس بہم پہنچائی تھی۔

آپ نے ۲۹/سال کی عمر میں حج کیا، ۹/شوال ۱۳۲۵ کو دس بجے دن گھر سے نکلے، ظہر کی نماز بڑی جماعت کے ساتھ مئو اسٹیشن پر پڑھی، مولانا عبدالغفار امام تھے، بمبئی کا ٹکٹ دس روپیہ نو آنہ میں ملا ایک بجے دن میں ٹرین چھوٹی، عصر کی نماز اوڑیہار میں پڑھی، غروب آفتاب کے ساتھ بنارس پہنچے نماز مغرب کینٹ میں پڑھی، پھر کھانے اور نماز عشاء سے فارغ ہوکر مغل سرائے جانے والی گاڑی میں سوار ہوئے جو پچھم سے آئی تھی آٹھ ساڑھے آٹھ بجے مغل سرائے پہنچے اور مسافر خانہ میں اسباب سرہانے رکھ کر بآرام تمام رات بسر کی، ۱۰/بجے دن کلکتہ سے بمبئی میل آیا، اس میں صرف ایک ڈبہ (بوگی) تیسرے درجہ کی تھی باقی سب ڈیوڑھا سکنڈ اور فرسٹ کلاس تھا، اس لیے بڑی بھیڑ تھی ایک ڈبہ (کمپارٹمنٹ) میں اسباب بھرا تھا وہی خالی ہوا تو کسی طرح جگہ ملی، دس دس بارہ اسٹیشن چھوڑ کر گاڑی دس پندرہ منٹ کے لیے کھڑی ہوتی تھی، اس میں اور کوئی تکلیف نہیں تھی، بس رش کی وجہ سے نماز پڑھنے اور وضو کرنے کی جگہ بدقت ملتی تھی، مغل سرائے سے ۱۰/شوال روز یکشنبہ ۱۰½ساڑھے دس دن میں چلے، اور ۷/بجے شام کے قریب جبل پور پہنچے، میل سے سفر کرنے والے مسافر کو یہاں سے تین روپیہ تین آنہ زائد محصول ادا کرنا پڑتا ہے، ورنہ پسنجر گاڑی پکڑنا پڑے گی اس لیے ایک پولیس مین کو ۴/ اجرت، اور تین روپیہ تین آنہ دے کر ٹکٹ درست کرایا۔ ۱۱/شوال کو ایک بجتے بجتے بمبئی پہنچ گئے، بمبئی اسٹیشن پر بیل گاڑی اور گھوڑا گاڑی کی بہت کثرت تھی آٹھ آنے پر گاڑی کرایہ کر کے محمد عرب کی چال

بھنڈی بازار کے قریب پہنچے، مسافر خانوں سے مسافروں کے مال کی چوری بہت ہوتی ہے۔

۲۵ روپیہ میں سارا سامان سفر (جس میں آٹا، چاول، دال، برتن، کپڑے اور جوتے سب شامل ہیں) خریدا، حاجی عبدالکریم مئوی اورنگ آبادی کے ذریعہ جہاز کا ٹکٹ خریدا، ۳۰ روپے ٹکٹ کے اور دس روپے فیس قرنطینہ ادا کی گئی جہاز کا نام بدرّی تھا اس کا مالک غلام علی پچھاری والا تھا، ٹکٹ کا آدھا حصہ پھاڑ کر عدن سے پہلے لے لیا گیا، ۲۵/ نومبر ۱۹۰۷ مطابق ۱۸/ شوال ۱۳۲۵ھ کو بارہ بجے دن میں جہاز نے لنگر اٹھایا، جہاز کی روانگی سے دو ایک دن پہلے گھنٹی بجتی ہے اور شہر میں منادی کرائی جاتی ہے۔

۵/ بجے صبح ہر مسافر کو بھپارے گھر میں حاضر ہونا تھا مولانا اپنے قلمی سفر نامہ میں لکھتے ہیں کہ ہم دس آنے میں گھوڑا گاڑی کر کے سویرے پہنچے، وہیں فجر کی نماز پڑھی، غلہ اور برتن کو بھپارا نہیں دیتے، اس گھر میں داخل ہونے کا وقت ۸/ بجے تھا، داخلہ کے وقت بڑی بھیڑ اور سخت دھکم دھکا تھا۔ اندر داخل ہوئے تو سب لوگوں کی صف بنائی گئی ایک شخص آیا اس نے کمر اور بدن کو ہاتھ لگایا کہ بخار تو نہیں ہے، دوسرا ایک سُرخ رنگ کی مہر لگاتا ہوا آیا، ٹکٹ کو سینہ پر رکھا اور ٹکٹ کے ساتھ کرتے پر بھی مہر لگاتا چلا گیا۔ اس کے بعد دو آنے پر قلی کر کے جہاز تک سامان پہنچایا گیا، جہاز میں دھکا کھاتے ہوئے اپنے ہاتھ سے سامان پہنچایا، وہاں پہنچ کر دیکھا کہ ہر جگہ بستر پڑا ہوا ہے حالانکہ مسافر نہیں ہیں، معلوم ہوا کہ یہ قلیوں کی حرکت ہے ایک روپیہ دیکر ایک قلی سے اچھی ہوادار جگہ حاصل کی۔

۱۲/ بجے دن میں جہاز روانہ ہوا، اس دن کچھ نہیں معلوم ہوا، دوسرے دن (سہ شنبہ) کو چکر شروع ہوا، خوب خوب قے ہوئی، چلپچی کا رکھنا بہت مفید ہوا، بدھ جونہی آیا قے بند ہوگئی، دن بھر پڑا رہا، پنج شنبہ کو کچھ تھوڑا کھایا، اسی دن سے چکر میں کمی شروع ہوئی اور جمعہ تک بہت کم ہوگیا، اب آرام سے کھاتے پیتے تھے جہاز میں بھیڑ کی وجہ سے پیشاب، کھانا پکانے اور پانی لینے کی بہت تکلیف ہوتی ہے، سمندر کا پانی، مشین سے میٹھا بنا کر دیا جاتا ہے۔

پہلے چھتری پر جانے کی اجازت نہ تھی جب گرمی سخت اور بعض بعض بیمار ہوگئے تو ڈاکٹر نے اجازت دی کہ جب طبیعت گھبرائے تو اوپر چلے جایا کرو۔ ساتویں دن ایک اندھیرا سا پہاڑ نظر آیا، سہ شنبہ کو صبح کے وقت عدن پہنچے، شہر بندرگاہ سے ٦ میل دور ہے، یہ بندرگاہ بہت بارونق ہے، متعدد جہاز یہاں ٹھہرتے ہیں، کنارے پر پہاڑ بہت ہیں ان پر سفید سفید بنگلے نظر آتے ہیں۔ سات دن تک پانی کے سوا

کچھ دکھائی نہ دیا جب عدن میں عمارتیں نظر آئیں تو بڑی فرحت محسوس ہوئی، تھوڑی دیر میں کشتیاں پہنچنا شروع ہوئیں ہر کشتی میں گوشت، آلو، دال، شکر، سیب وغیرہ موجود تھے، مسافر جہاز پر سے سامان خریدتے ہیں۔ اور بیچنے والے ایک ٹوکری سامان رکھ کر اس میں بندھی ہوئی رسی کو جہاز پر پھینک دیتے خریدار رسی کھینچ کر سامان لے لیتا ہے اور ٹوکری میں سودے کی قیمت رکھ دیتا ہے صبح سے شام تک خرید و فروخت ہوتی رہی، میں نے بھی حلوا، سیب، گوشت اور آم خریدا۔

عدن سے آدھ آنہ ایک پائی میں ہندوستان خط جاتا ہے اور بیرنگ بھی جاتا ہے، ہم نے بھی چار پانچ خط لکھ کر ایک ملازم کو دے دیا، مولوی عبدالہادی صاحب مرید و خلیفہ حضرت چاند شاہ صاحب بھی جہاز میں ہم سفر تھے انھوں نے بھی خط بھجوایا، عدن میں نماز جانب شمال ہوتی ہے، عدن سے دو دن میں یا تیسرے دن جہاز کامران پہنچا، اور سیڑھیوں کے ذریعہ ضروری سامان ساتھ لیے چھوٹی کشتیوں میں اترے اور قرنطینہ میں پہنچے اور آٹھ دن قرنطینہ میں رہے جہاز والے فی صندوق ایک روپیہ آٹھ آنہ اور فی بوری نصف صندوق ۱۲؍ کرایہ لے کر جہاز میں زائد سامان محفوظ کر دیتے ہیں اور قرنطینہ سے واپسی کے بعد سامان دیدیتے ہیں، قرنطینہ کے بعد دوبارہ جہاز پر سوار ہوئے اور دو یا تین دن میں جہاز جدہ پہنچا، کشتیوں کے ذریعہ کنارہ پہنچے۔ جدہ سے اونٹ پر مکہ روانہ ہوئے صبح سویرے چلے تھے شام کو حدہ پہنچے وہاں رات گزار کر صبح کو چلے اور شام ہوتے ہوئے مکہ معظّمہ میں داخل ہو گئے۔

مولانا کی وفات ۱۳۰۱ھ میں آپ کا مزار عیدگاہ کے پیچھے محلّہ اورنگ آباد میں ہے۔

**مولانا عاشق الٰہی میرٹھی** آپ نے غالباً ۱۳۲۶ھ میں حج کیا، اور ۱۳۲۷ھ میں زیارۃ الحرمین لکھی، فرماتے ہیں اس وقت جہاز اسلامی، رحمانی، رضوانی، علوی، خسرو، دارا اور اکبر تھے، یہ سب جہاز مغل کمپنی کے تھے۔

جدہ سے مکہ ۷۵ کلومیٹر (یعنی تقریباً ۴۶ میل) ہے، اور جدہ سے مدینہ منورہ ۴۵۰ کلومیٹر (یعنی تقریباً ۲۸۱ میل) ہے

مکہ و مدینہ کی درمیانی منزلیں یہ ہیں۔

عسفان، قضیمہ، رابغ، ابیار بن حصانی، بیر الشیخ، بیر درویش، اور الحسا، ینبع سے مدینہ ۲۵۰ کلومیٹر یعنی ۱۵۶ میل، اور مکہ سے عرفات ۲۲ کلومیٹر، یعنی ۱۴ میل۔

سلطانی راستہ: مکہ سے مدینہ، وادی فاطمہ، عسفان، خلیص، القدیمہ ساحل سمندر پر، رابغ، مستورہ، صفراء (ایذہ) بیرالشیخ، دیار بن حصانی، حمراء الجدید، خیف، بیرعباس، بیر درویش، آبارعلی یہ راستہ مکہ سے غرب شمال کو جاتا ہے۔

فرعی راستہ: رابغ سے وادی حرشاں بجہت شمال مشرق، نقر الفار، بیر رضوان، ابوضباع وادی ریان، غدیر وادی معظم، بیرالماشی، آبارعلی۔

طریق غائر: رابغ سے مستورہ جانب شمال۔

طریق شرقی: جنۃ المعلی، بیاضیہ ہوتا ہوا منیٰ کے شمال مائل مشرق منازل وادی لیمون، حفائر، برکۃ السمرہ، حبیط، سفینہ، سویرجیہ، حجریہ، غدیر، سیدنا حمزہ۔

مولانا عاشق الٰہی نے اس کے بعد بھی کئی حج کیے ہیں۔

ان کی وفات ۱۳ھ میں ہوئی۔

تنبیہ: — متعدد سفرناموں میں کئی بے تحقیق باتیں بھی نظر آئیں، ہم نے ان کی اصلاح وتصحیح کی کوشش نہیں کی، صرف متنبہ کر دیا ہے۔

**ابوالغنائم الظاہر ذوالمناقب** معمر بن محمد نام تھا اولاد ابی طالب کے نقیب اور امور حج کے والی تھے۔ خلیفۂ بغداد نے ان کو ۴۵۶ھ میں خلعت اور یہ مناصب والقاب عطا کیے، ابوالحسن اقساسی کے بعد ۴۱۶ھ سے ۴۵۵ھ (یعنی چالیس برس) تک ایسی بدنظمی، فتنۂ وفساد اور اضطراب رہا کہ اس درمیان میں شاید ہی کوئی منظّم قافلہ خراسان وعراق سے حج کے لیے گیا ہو، ۴۵۶ھ میں کسی قدر اطمینان نصیب ہوا تو ابوالغنائم امیر حج مقرر ہوئے، اس وقت سے ۴۶۶ھ تک چند برسوں کے استثنا کے ساتھ حجاز کا قافلہ انھیں کی سرکردگی میں جاتا آتا تھا اور انھیں کی قیادت میں حج کرتا تھا، درمیان میں ایک سال ۴۵۸ھ میں نورالہدیٰ ابوطالب کی قیادت میں قافلہ گیا مگر وہ مکہ جا کر وہیں مقیم ہوگئے۔ پھر ۴۶۷ھ میں بھی ابوطالب ہی کی قیادت میں قافلہ گیا، ابوالغنائم علوی نہایت کثیر العبادۃ اور خوش اخلاق تھے۔ کوئی نہیں بتا سکتا کہ انھوں نے کسی مخلوق کو تکلیف پہنچائی ہو ۴۹۰ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ (ابن الجوزی وابن کثیر)

(جاری ہے)

# لباس اور اسلام

جناب ہلال احمد صاحب مالیگاؤں

[''لباس اور اسلام'' یہ مضمون دو قسطوں پر مشتمل ہے۔موجودہ قسط میں لباس کے متعلق اسلامی احکام ''فرض'' یا اس کی ضد ''حرام'' کا بیان ہے۔آئندہ قسط انشاءاللہ ایسے مضمون پر مشتمل ہوگی جس میں ایسے لباس کے متعلق دلائل ہوں گے جسے اسلامی لباس تسلیم کیا گیا ہے اور جس پر اسلامی احکامات ''مسنون'' یا ''مستحب'' صادق آتے ہیں۔''لباس اور اسلام'' کی موجودہ قسط کے مضمون کو مرتب کرنے میں ذیلی عنوانات اور روایات کے سلسلے میں کتاب ''شمائلِ کبریٰ جلد اول (مؤلف مولانا مفتی محمد ارشاد القاسمی مدظلہ العالی)'' سے مدد لی گئی ہے۔اس مضمون کو میں نے چار قسطوں میں اپنے اخبار ''ترجمان شریعت'' میں شائع کیا اور نئی ترتیب کے ساتھ مجلّہ ''المآثر'' میں اشاعت کی درخواست کے ساتھ روانہ کر رہا ہوں۔ہلال احمد، مالیگاؤں]

جب سے یہ دنیا قائم ہوئی ہے اب تک تو یہ تسلیم شدہ ہے کہ انسان اور حیوان میں فرق ''لباس'' کا ہے۔انسان ستر چھپانے یا لباس پہننے کا مکلّف ہے اور لباس پہننے پر اُسے اجر وثواب بھی ملتا ہے۔لباس انسانی معاشرہ میں بہت ہی اہمیت کا حامل ہے۔عصری درس گاہوں میں تو لباس دیکھ کر ہی متعین کر دیا جاتا ہے کہ یہ شخص فلاں درس گاہ کا ہے، یا فلاں ملک کا فوجی ہے، یا پولس ہے، یا فلاں شعبہ کا ہے۔بین الاقوامی طور پر لباس دیکھ کر متعین کیا جاتا ہے کہ یہ شخص فلاں مذہب کا ہے کیونکہ ہر مذہب کا اپنا مخصوص لباس متعیّن ہے۔جب لباس اتنی اہمیت کا حامل ہے تو اسلام میں کیسے اس سے صرفِ نظر کیا جا سکتا ہے۔جو حضرات مغربی تہذیب سے متاثر ہیں اور اہلِ مغرب کا لباس پہننا چاہتے ہیں لیکن ساتھ میں یہ بھی چاہتے ہیں کہ ان کے کسی فعل کو اسلام کے خلاف نہ سمجھا جائے (اگر چہ وہ فعل خلافِ اسلام ہو) تو وہ حضرات اسلامی لباس کو دیکھ کر مختلف فقرے استعمال کرتے ہیں مثلاً ''یہ لباس

کہاں سے لائے''، ''لباس کے متعلق اسلام کا کوئی حکم نہیں''، ''لباس ذاتی معاملہ ہے اس میں اسلام کا کیا دخل ہے؟'' وغیرہ وغیرہ۔ جب کہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں صاف صاف اعلان کررہا ہے ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْناً﴾ آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کردیا اور دین کے اعتبار سے میں تمہارے لئے اسلام پر راضی ہوا (سورۃ المائدۃ آیت ۳)۔

یہ بات مسلّم ہے کہ دین کے پانچ شعبے ہیں۔(۱) عقائد (۲) عبادات (۳) اخلاق (۴) معاشرت (۵) معاملات۔

لباس کا تعلق معاشرت سے ہے، تو کیا معاشرت کے بارے میں اسلام ادھورا ہے؟ **(نعوذ باللہ من ذلک)**۔ ہرگز نہیں۔ لباس کا تعلق چونکہ دین کے شعبۂ معاشرت سے ہے، لہٰذا دین اسلام کے مکمل ہونے کی وجہ سے شعبہ معاشرت یعنی ''لباس'' میں بھی اسلامی احکام نافذ ہوں گے۔ یعنی اس میں بھی فرض، سنت، مستحب، مباح، مکروہ اور حرام کے احکام ہیں۔

**لباس کے اسلامی احکام:** لباس کے سلسلہ میں درج ذیل امور میں اسلامی حکم ''فرض'' یا اس کی ضد ''حرام'' نافذ ہوگا۔

(۱) ستر (۲) لباس کی مقدار (۳) تشبُّہ یا مشابہت (۴) اسلامی حرمت (لباس کی قسم، تصویر، شہرت)

**(۱) سَتر:** ۔لباس میں ستر کا چھپانا فرض ہے۔ مردوں کیلئے ''ناف سے گھٹنوں تک کا حصّہ سَتر ہے''۔ ایسا لباس جو ناف سے گھٹنوں تک کا حصّہ نہ چھپائے ''حرام'' ہے۔ عورتوں کیلئے ''چہرہ اور ہاتھوں کے سوا تمام بدن ستر ہے'' اور اسے چھپانا فرض ہے۔ اسلئے ایسا لباس جس سے عورتوں کی ستر نہ ڈھکے ''حرام'' ہے۔ عورتوں کیلئے مسنون ومشروع یہ ہے کہ لباس موٹا ہو جس سے بدن کا رنگ اور بال نظر نہ آئے، لباس ڈھیلا ڈھالا ہو، چست نہ ہو اور بدن کی ہیئت کو نمایاں اور ظاہر کرنے والا نہ ہو۔

**عورتوں کیلئے باریک لباس کی ممانعت:** حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ نبی کریم ﷺ کے پاس تشریف لائیں اور انکے جسم پر باریک کپڑا تھا۔ آپ نے بے رخی برتی اور فرمایا اے اسماء! جب عورت بالغ ہوجائے تو اسکا جسم ایسا نہ ہو کہ نظر آجائے مگر یہ اور یہ، اور آپ ﷺ نے چہرے اور

ہاتھ کی طرف اشارہ کیا۔(بحوالہ مشکوۃ ص ۳۷۷)

**باریک دوپٹہ کی ممانعت:** حضرت علقمہؒ نے اپنی والدہ سے نقل کیا ہے کہ حفصہ بنت عبدالرحمٰنؒ حضرت عائشہؓ کے پاس آئیں وہ باریک دوپٹہ اوڑھے ہوئے تھیں،حضرت عائشہؓ نے اسے پھاڑ ڈالا اوراسے گاڑھا دبیز دوپٹہ پہنادیا(مؤطامالک بحوالہ مشکوۃ ص ۳۷۷)

**باریک لباس والی مثل ننگی ہے:** حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ حضور اقدسؐ نے ارشادفرمایا دوزخیوں کے دوگروہوں کو میں نے نہیں دیکھا(یعنی اس وقت تک ظہورنہیں ہوابعد میں ایسی جماعت پیدا ہوگی)ایک جماعت ان لوگوں کی ہوگی جن کے پاس بیلوں کی دم کی طرح کوڑے ہوں گے،ان سے لوگوں کوظلماً ماریں گے۔دوسری جماعت ایسی عورتوں کی ہوگی جو(ظاہر میں تو) کپڑے پہنے ہوئے ہوں گی مگر ننگی ہوں گی،مردوں کو مائل کرنے والی اوران کی طرف مائل ہونے والی ہوں گی۔ان کے سر مانند اونٹ کے کوہانوں کے جھکے ہوئے ہوں گے یہ عورتیں نہ تو جنت میں داخل ہوسکیں گی اور نہ ہی جنت کی بو پاسکیں گی حالانکہ جنت کی خوشبواتنی دور سے(یعنی پانچ سومیل کی مسافت سے) آجاتی ہے۔(مسلم ج ۲ ص ۲۰۵)

اس حدیث میں دوپیشین گوئیوں میں سے دوسری پیشن گوئی ایسی عورتوں کے پائے جانے کے متعلق ہے جن کی یہ صفات ہوں گی۔

(۱) کپڑے پہننے کے باوجود ننگی ہونگی یا تو اس وجہ سے کہ کپڑا باریک ہوگا یا یہ کہ پورا بدن ڈھانکا نہ گیا ہوگا جیسے بلاؤز کہ اس سے پیٹ و پیٹھ کا حصّہ کھلا رہتا ہے یا کھل جاتا ہے۔اسی طرح فراک اور جانگیہ بھی۔یا اس وجہ سے کہ لباس اتنا چست وتنگ ہوگا کہ بدن کی پوری ہیئت نمایاں ہورہی ہوگی۔

(۲) حسن وخوبصورتی اور فیشن کی وجہ سے مردوں کو اپنی طرف دیکھنے کی اور حظ (مزہ) لینے کی دعوت دیں گی۔

(۳) خود وہ بھی مردوں کے قریب جائیں گی ان کی طرف خواہش سے متوجہ ہوں گی۔یعنی مائل کریں گی اورخود بھی مائل ہوں گی۔

(۴) ان کے سر بختی اونٹوں کے کوہان کی طرح ہوں گے،یعنی سر پر بالوں کو فیشن سے اونچا کریں گی جس سے سر اونچا اور خوبصورت ہوجائے گا۔

(۵) سر ہلا ہلا کر یعنی فیشن کی نمائش کرتی ہوئی مٹکتی ہوئی چال بناتی ہوئی چلیں گی۔ایسی عورتیں جنت تو دور کی بات ہے اس کی خوشبو بھی نہ پائیں گی۔ چنانچہ ایسی عورتیں آج کل کے دور میں پائی جارہی ہیں جن پر یہ علامتیں منطبق ہورہی ہیں۔

**(۲) لبـاس کـی مقدار:** ۔اسلام میں لباس کی کم سے کم مقدار اور زیادہ سے زیادہ مقدار مقرر ہے۔ اس سے کم پہننا اور اس سے زیادہ پہننا ''حرام'' ہے۔

**ٹخنوں سے نیچے پاجامہ یا لنگی یا تہبند باندھنے پر وعید:** حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ نبی پاک ﷺ نے فرمایا کہ ٹخنوں سے جو نیچا تہبند ہوگا وہ جہنم میں ہوگا۔(بخاری ج۲ص۸۶۱)

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ نبی پاک ﷺ نے فرمایا جو فخر کے مارے اپنے کپڑوں کو لٹکائے گا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس پر نظر نہیں فرمائیں گے۔(بخاری ج۲ص۸۶۱)

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ مومن کا تہبند نصف پنڈلی تک یا پنڈلی تک یا پھر ٹخنہ سے اوپر ہو اور جو ٹخنہ سے نیچا ہو تو جہنم کے لائق ہے۔(نسائی، ترغیب ج۳ص۸۸)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا تہبند اس طرح باندھو جس طرح فرشتے باندھتے ہیں، پوچھا وہ کیسے اے اللہ کے رسول؟ آپ نے فرمایا نصف پنڈلی تک۔(مجمع الزوائد ج۵ص۱۲۶)

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ تہبند نصف پنڈلی تک ہے تو یہ بات حضرات صحابہؓ پر شاق گزری پس آپ ﷺ نے فرمایا: ٹخنے تک، اور اس سے نیچے میں کوئی بھلائی نہیں(ترغیب ج۲ص۸۹)

حضرت مغیرہ بن شعبہؓ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے سفیان بن ابی سہلؓ کی کمر کو پکڑ کر فرمایا اوسفیان اپنی تہبند کو مت لٹکاؤ، اللہ تعالیٰ لٹکانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔(ابن ماجہ ج۲ص۲۹۴)

حضرت جابرؓ کی طویل روایت میں ہے کہ جنت کی خوشبو ایک ہزار میل کی مسافت سے آئیگی مگر خدا کی قسم پائجامہ لٹکا کر پہننے والے اس کی خوشبو نہ پائیں گے۔(ترغیب ص۹۱)

**تنبیہ:** خیال رہے کہ جس طرح پاجامہ، لنگی، تہبند کے نیچے ہونے کی ممانعت ہے، اسی طرح کرتے کے ٹخنے سے نیچے ہونے کی بھی ممانعت ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں جو آپ نے

تہبند کے بارے میں فرمایا وہی قمیص کے بارے میں بھی ہے۔ (آداب بیہقی ص ۳۵۵)

**پاجامہ اور تہبند کہاں باندھے؟** حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ نبی پاک ﷺ ناف کے (ذرا) نیچے ازار (تہبند) باندھا کرتے تھے کہ ناف پر معلوم ہوتا تھا۔ (زرقانی ج۵ ص۲۶)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عمر بن الخطابؓ کو دیکھا کہ ناف سے اوپر ازار باندھا کرتے تھے۔ (زرقانی ج۵ ص۲۶)

**نصف ساق تہبند سنّتِ ملائکہ ہے:** حضرت عمرو بن شعیبؒ کی روایت اپنے دادا سے ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: اللہ کے حضور میں حضرات ملائکہ نصف پنڈلی تک تہبند باندھے رہتے ہیں۔ تم بھی اسی طرح باندھو۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا تہبند اس طرح باندھو جس طرح فرشتے باندھتے ہیں۔ پوچھا وہ کیسے اللہ کے رسول؟ آپ ﷺ نے فرمایا نصف پنڈلی تک۔ (مجمع الزوائد ج۵ ص۱۲۶)

**ٹخنے سے نیچے منافق کی پہچان ہے:** حضرت علیؓ سے مرفوعاً روایت ہے آپ ﷺ نے فرمایا تہبند کا لٹکانا منافق کی پہچان ہے۔ (کنز ج۱۹ ص۲۲۸)

**انتباہ: (عورتوں کیلئے حکم):** خیال رہے کہ ٹخنوں سے نیچا تہبند، ازار، چادر لٹکانے کی وعید صرف مردوں کے حق میں ہے، عورتیں اس میں شامل نہیں۔ آپ ﷺ نے عورتوں کو ٹخنے ڈھانکنے کا حکم دیا ہے۔ چنانچہ اُمّ سلمہؓ نے جب ازار لٹکانے کی وعید سنی تو آپ ﷺ سے معلوم کیا پھر عورتوں کا کیا حال رہے گا؟ آپ نے فرمایا اگر قدم کھل جائے تو وہ کپڑے نیچے لٹکالیں، چنانچہ آپؐ نے قدم تک چھپانے کی اجازت دی۔ (جمع الوسائل ص۱۷۴)

### ﴿۳﴾ تشبہ یا مشابہت:۔

**عورتوں اور مردوں کو ایک دوسرے کے لباس سے مشابہت پر وعید:** حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے لعنت فرمائی ہے ان مردوں پر جو عورتوں سے اور ان عورتوں پر جو مردوں سے مشابہت اختیار کرنے والے ہیں۔ (بخاری ج۲ ص۸۷۴، ابوداؤد)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا جو مرد عورتوں سے

مشابہت اختیار کرنے والے ہیں اور جو عورتیں مردوں سے مشابہت اختیار کرنے والی ہیں وہ ہم میں سے نہیں ہیں۔ (مسند احمد ص ۲۲۳، کنز)

**دنیا و آخرت کی لعنت:** حضرت ابوامامہؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا چار شخصوں پر دنیا اور آخرت کی لعنت ہے اور فرشتوں کی ان پر آمین ہے (یعنی لعنت پر) ان میں سے ایک تو وہ ہے جسے خدا نے مرد بنایا اور وہ عورتوں کی مشابہت اختیار کرتا ہے اور اپنے کو مثل عورت کے بناتا ہے۔ (ترغیب ج ۳ ص ۱۰۵)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا تین شخص جنت میں داخل نہ ہوں گے: (۱) والدین کا نافرمان (۲) دیوث جو عورتوں کے اجانب سے مخالطت میں ڈھیلا ہو (۳) عورتوں کی طرح لباس اختیار کرنے والا ہو۔ (ترغیب ج ۳ ص ۱۰۶)

**تشبہ اور اس کا مفہوم:** اپنی ہیئت اور وضع تبدیل کر کے دوسری قوم کی وضع اور ہیئت اختیار کرنے کا نام تشبہ ہے۔ کافروں کا معاشرہ اور تمدن اور لباس اختیار کرنا درپردہ ان کی سیاست اور برتری کو تسلیم کرنا ہے، کیا یہ صریح ظلم نہیں کہ دعویٰ تو ہو ایمان کا، اسلام کا، اللہ اور رسول کی محبت کا اور صورت، ہیئت اور وضع قطع اور لباس اس کے دشمنان کے۔ (العیاذ باللہ)

**غیروں کے لباس کی ممانعت:** حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کی روایت ہے کہ رسول پاک ﷺ نے میرے اوپر دو زرد رنگ کے کپڑے دیکھے، تو آپ نے فرمایا یہ کافروں کا لباس ہے ان کو مت پہنو، ایک روایت میں ہے کہ عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ نے کہا میں ان (کے رنگ) کو دھو دوں گا تو آپ ﷺ نے فرمایا نہیں بلکہ جلا دو۔ (مسلم ج ۲ ص ۱۹۳)

حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت ہے کہ حضرات صحابہؓ نے کہا: اے اللہ کے رسول مشرکین پاجامہ تو پہنتے ہیں مگر تہبند نہیں باندھتے، آپ ﷺ نے فرمایا تم پاجامہ بھی پہنو اور تہبند بھی باندھو، حضرات صحابہؓ نے کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ مشرکین خف تو باندھتے ہیں مگر نعل نہیں پہنتے؟ آپ ﷺ نے فرمایا تم خف و نعل یعنی موزہ جوتا دونوں پہنو۔ جہاں تک جس قدر ہو سکے شیطان کے دوستوں کی مخالفت کرو۔

حضرت ابوامامہؓ کہتے ہیں کہ میں نے حضور اکرم ﷺ سے عرض کیا کہ اہل کتاب لنگی نہیں

باندھتے بلکہ پاجامہ پہنتے ہیں۔حضور اکرم ﷺ نے فرمایا تم لوگ ان کے خلاف کرو پاجامہ بھی پہنو اور لنگی بھی باندھو۔(خصائل ص ۹۵، زادج ۱ ص ۵۱)

حضرت ابو کریمہؓ نے کہا کہ میں نے حضرت علی ابن ابی طالبؓ کو کوفہ کے منبر پر خطبہ دیتے ہوئے سنا کہ وہ کہہ رہے تھے اے لوگو! (سنو) میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا کہ آپ ﷺ فرمارہے تھے خبردار! راہبوں (عیسائی عبادت گزاروں) کے لباس کی مخالفت کرو، جو راہبانہ طریقہ اختیار کرے گا یا اس سے مشابہت اختیار کرے گا وہ ہم میں سے نہیں ہے جس کی مشابہت اختیار کرے گا اسی کے گروہ سے ہوگا۔ (مجمع ج ۵ ص ۱۲۴)

**〈۴〉 اسلامی حرمت :۔ لباس کی قسم :**

**ریشمی لباس کی حرمت:** حضرت عمر بن خطابؓ فرماتے ہیں کہ رسول پاک ﷺ نے فرمایا: ریشمی لباس مت پہنو، جو اسے دنیا میں پہنے گا آخرت میں اس سے محروم رہے گا۔ (مسلم ج ۲ ص ۱۸۹)

**سونے چاندی کے لباس کی حرمت:** حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی اکرم ﷺ کو دیکھا دائیں ہاتھ میں ریشمی کپڑا اور بائیں ہاتھ میں سونا لئے فرمارہے تھے یہ دونوں حرام ہیں ہماری امّت کے مردوں پر۔(ابوداؤدونسائی، ترغیب ج ۳ ص ۹۶)

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا جب میری امت پانچ چیزوں کو حلال سمجھنے لگے گی یعنی اس کا ارتکاب کرنے لگے گی تو ان پر ہلاکت و بربادی آجائے گی (۱) جب ایک دوسرے پر لعنت بھیجیں (۲) شراب پینے لگ جائیں (۳) ریشمی لباس استعمال کرنے لگیں (۴) گانے والی باندیاں اختیار کی جانے لگیں (۵) مرد اور عورت اپنے آپ کو کافی سمجھنے لگیں یعنی شادی کی ضرورت نہ سمجھیں۔

**تصویر دار کپڑے کی ممانعت:** حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے ایک چادر خریدی جس میں تصویر تھی، جب آپ ﷺ نے اسے دیکھا تو دروازے پر ہی کھڑے رہے، اندر تشریف نہ لائے، میں نے آپ کی ناراضگی کو سمجھ لیا، میں نے کہا میں اللہ اور اس کے رسول سے توبہ کرتی ہوں اپنی غلطی پر، پھر آپ ﷺ نے فرمایا اصحاب تصاویر کو قیامت کے دن عذاب دیا جائے گا اور آپ نے فرمایا وہ گھر جس میں تصاویر ہوں اس میں فرشتے داخل نہیں ہوتے۔(مسلم ج ۲ ص ۲۰۰، بخاری ج ۲ ص ۸۸۰)

**فائدہ:** اس سے معلوم ہوا کہ تصویر دار کپڑے یا چٹائی یا بستر کا استعمال خلاف شرع ہے۔آج کل تصویر

دار اشیاء کے استعمال کی بڑی کثرت ہوگئی ہے اور بلا جھجک اس کا استعمال کیا جاتا ہے، اور مکانوں اور دکانوں کو مزین کیا جاتا ہے۔ بڑی ہلاکت و بربادی کی بات ہے، ذرا بھی شریعت کا لحاظ نہیں، وہ گھر، مکان اور دکان فرشتۂ رحمت کی آمد سے محروم رہتے ہیں جہاں یہ بدبخت تصویریں ہوتی ہیں۔

**تصویر اور آج کل کا ماحول:** جاندار کی تصویر متعدی گناہوں میں سے ہے یعنی تصویر والا تو گناہ گار ہوتا ہی ہے، لیکن اس کی نحوست ماحول پر بھی پڑتی ہے اور رحمت کے فرشتوں کی آمد میں رکاوٹ بنتی ہے۔ آج کل تو یہ حال ہوگیا ہے کہ مساجد میں بھی ایسا لباس پہن کر آتے ہیں جن پر پرندوں کی یا گھوڑوں کی یا جانداروں کی تصویریں بنی ہوتی ہیں۔ ان تصاویر سے خود کی نماز تو خراب ہوتی ہی ہے، ساتھ میں مسجد کے اندر بھی رحمت کے فرشتوں کے لئے رکاوٹ کا سبب بنتے ہیں۔

**مردوں کے لئے سرخ اور زعفرانی رنگوں کے لباس کی ممانعت:**

حضرت عمران بن حصینؓ فرماتے ہیں کہ نبی پاک ﷺ نے فرمایا کہ خبردار لال رنگ مت استعمال کرو، یہ شیطان کا محبوب رنگ ہے۔ (مجمع ج۵ ص۱۳۳)

حضرت براءؓ فرماتے ہیں کہ نبی پاک ﷺ نے لال ریشمی جوڑے سے منع فرمایا ہے (بخاری ج۲ ص۸۶۸)

حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ آپ ﷺ لال رنگ کو ناپسند فرماتے تھے (عمدۃ القاری ج۲۲ ص۲۳)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ و رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے میرے جسم پر سرخ لباس دیکھ کر فرمایا یہ کفار کا لباس ہے اسے نہ پہنو۔ (مسلم ج۲ ص۱۹۳)

حضرت عمران بن حصینؓ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا میں سرخ و زرد رنگ کو استعمال نہیں کرتا۔ (بحوالہ مشکوۃ ص۳۷۵)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی پاک ﷺ نے مردوں کو زعفرانی رنگ سے منع فرمایا ہے۔ (بخاری ج۲ ص۸۶۹)

**شہرت کا لباس:** حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا جو شخص ایسا کوئی لباس پہنے جس سے وہ دوسرے پر بڑائی ظاہر کرے اور یہ کہ لوگ اس کی طرف دیکھیں تو خداوند قدوس اس کی طرف نگاہ نہیں فرمائے گا تاوقتیکہ وہ اسے اتار نہ دے۔ (طبرانی)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا جو شہرت (نام ونمود اور دکھاوے) کے لئے کوئی کپڑا پہنے گا تو اللہ تعالیٰ اس کپڑے کو قیامت کے دن پہنائے گا اور جہنم کی آگ اس میں لگادے گا۔ (رزین، ترغیب ج۳ص۱۱۶)

اور ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا جو شہرت کے لئے دنیا میں کوئی لباس پہنے گا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ذلت کا لباس پہنائے گا پھر اس میں جہنم کی آگ لگادے گا۔ (ترغیب ج۳ص۱۱۶)

حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا جو شہرت کے لئے لباس پہنتا ہے اللہ تعالیٰ اس سے اعراض فرمالیتے ہیں تاوقتیکہ اسے نکال نہ دے۔ (ترغیب ج۳ص۱۱۶)

**فائدہ:** شہرت کے لباس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی اچھا امتیازی لباس اس لئے پہنے تا کہ لوگوں میں اس کے لباس کا چرچا ہو۔ لوگ اس کے لباس کی تعریف کریں سو یہ نیت درست نہیں۔ خدا کے نزدیک ذلت ورسوائی وناراضگی کا باعث ہے۔ لباس میں نیت ہو کہ اللہ نے ستر چھپانے کو دیا ہے اور یہ اس کی تعمیل ہے اور یہ نیت ہو کہ اللہ تعالیٰ جمیل ہے اور نظافت وجمال کو پسند کرتا ہے اس لئے نظیف وجمیل لباس پہنتا ہوں یا یہ کہا اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا اظہار ہو اس لئے ہمیں اظہار نعمت کا حکم دیا ہے، یہ قصد وارادے محمود ہیں اور باعث ثواب ہیں۔

**امّت کے بدترین لوگ:** حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کہ آپ ﷺ نے فرمایا میری امت کے بدترین لوگ وہ ہوں گے جو ناز ونعمت میں ہوں گے رنگ برنگ کے کھانے اور رنگ برنگ کے کپڑے میں لگے رہیں گے اور بات خوب بنائیں گے (ترغیب ج۳ص۱۱۵)

**باعث شہرت لباس کی ممانعت:** حضرت عبداللہ بن عمرؓ رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ نبی پاک ﷺ نے دو قسم کے لباس سے منع فرمایا ہے ایک جو خوبی کی وجہ سے مشہور ہو جائے، دوسرا جو بدنمائی کی وجہ سے مشہور ہو جائے (طبرانی، مجمع ۵ص۱۱۵)

**فائدہ:** یعنی ایسا گراں یا عمدہ وخوبصورت زینت والا ہو کہ لوگوں میں اس کا چرچا ہو جائے کیونکہ یہ عجب اور کبر کا باعث ہو سکتا ہے، اسی طرح اس کا عکس بھی مذموم ہے کہ بےعزتی وانگشت نمائی کا باعث ہو۔

اللہ تعالیٰ کا قرآن کریم میں صاف صاف اعلان ہے ''لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِی رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ'' تحقیق کہ تمہارے لیے اللہ کے رسول میں اچھا اُسوہ (پیروی) ہے۔ (سورۃ احزاب آیت ۲۱)۔

**اُسوۂ رسول اللہ ﷺ کا مفہوم:** خیال رہے رسول اللہ ﷺ کا صرف قول وفعل (یعنی حدیث) اُسوۂ حسنہ نہیں ہے، بلکہ آپ ﷺ کے پاکیزہ اخلاق وعادات خواہ ان کا تعلق طبعی وبشری اُمور سے کیوں نہ ہو سب اُمّت کے لیے اُسوۂ حسنہ ہیں۔ بعض ناواقفِ حقیقت حضرات نے رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ مقدّس کو صرف عبادات میں اُسوہ تسلیم کیا ہے، باقی حیاتِ طیّبہ کے احوال وعادات کو اُسوہ ہونے سے خارج کردیا، یعنی ان کے نزدیک ان میں آپ ﷺ نمونۂ عمل (اُسوہ) نہیں ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ معاشرتی اُمور میں عادات وماحول میں حضور ﷺ عرب کے تابع تھے، وہاں کا عُرف ورواج جو تھا اسی کی رعایت کرتے تھے، مثلاً آپ ﷺ داڑھی رکھتے تھے چونکہ وہاں کا ماحول تھا، آپ ﷺ ٹوپی پہنتے تھے چونکہ ٹوپی کا رواج تھا، خلاصہ یہ کہ یہ اُمور ماحول اور رواج کے طور پر تھے، اس لیے امور مذکورہ وغیرہ کی اتباع باعثِ ثواب نہیں ہے، یہ بہت بڑی باعثِ شقاوت غلط فہمی ہے۔ آپ ﷺ کے اطوار و طریقے، جن کا تعلق چاہے بشر وطبعی امور سے ہو تعلیم وتربیت ربّانی کے ماتحت ہونے کی وجہ سے قابلِ عمل اور مشعلِ راہ ہے۔ حضرت رسول مقبول ﷺ کی پوری زندگی امت کے لیے اُسوۂ حسنہ ہے، امام غزالیؒ فرماتے ہیں ''جاننا چاہئے کہ سعادت کی کنجی تمام امور میں رسول اللہ ﷺ کی اتباع ہے، آپ ﷺ سے صادر ہونے والے، وارد ہونے والے تمام امور میں حرکات وسکنات میں حتیٰ کہ کھانے پینے یا سونے، اُٹھنے اور کلام کرنے میں بھی، عبادات کے علاوہ میں آپ کی عادتِ طیّبہ کے چھوڑنے کی کوئی وجہ نہیں، اسی لیے میں صرف عبادات میں منحصر نہیں کرتا بلکہ تمام عادات واحوال میں بھی، کمالِ اتباع اسی سے حاصل ہوگی............ لباس اور بشری اُمور میں آپ ﷺ کی اتباع مطلوب وفلاح کا باعث ہے............ پس سنت کی اتباع تم پر لازم ہے کہ تم پاجامہ کو بیٹھ کر پہنو اور عمامہ کھڑے ہوکر باندھو، جوتا اوّلاً دائیں پیر میں پہنو اور دائیں ہاتھ سے کھاؤ۔

جو لوگ آپ کی اتباع کو تمام امور میں مطلوب نہیں مانتے، بلکہ صرف عبادات میں محصور مانتے ہیں وہ دراصل اس دروازہ سے نفس کی آزادی چاہتے ہیں اور اپنے آپ کو ایک عظیم سعادت سے محروم کرنا چاہتے ہیں...... عادات واطوار میں سنّت کا ترک سعادتِ عظیمہ سے محرومی کا باعث ہے (اربعین ص ۵۸)۔

# اسلامی کتب خانے

(تیرہویں قسط)

از: دکتور علی بن علی ابو یوسف جہنی ترجمہ وتلخیص: مسعود احمد الاعظمی

## کتب خانہ بیت الحکمت کا انتظام:

اس کتب خانے کے انتظام وانصرام، اس کے اہتمام اور نگرانی کی ذمہ داری اُس دور کے متعدد اہل علم وادب اور ارباب ترجمہ وتحقیق کے سپرد رہی، اور اس میں جو لوگ تعریب وترجمہ کے کام سے وابستہ رہے، ان میں مشہور افراد حسب ذیل ہیں:

۱- ابوسہل بن نوبخت: ہارون رشید کے خزانۃ الحکمت میں کام کیا کرتا تھا، اور اس کا شمار فارسی سے عربی کے بہترین ترجمہ نگاروں میں ہوتا تھا۔ (۱)

۲- ابوزکریا یحی بن ماسویہ (متوفی ۲۴۳ھ): ہارون رشید، امین ومامون، معتصم، واثق اور متوکل کے مترجمین میں تھا، کہا جاتا ہے کہ مخطوطات کی تحصیل اور فراہمی کے لیے اس کو شاہ روم کے پاس بھی بھیجا گیا تھا۔ (۲)

۳- حنین بن اسحاق عبادی مشہور طبیب: فن طب کا امام، بہت فصیح اور زبان آور تھا، اس کا تعلق حیرہ کے عربوں سے تھا، ہارون رشید نے قدیم کتابوں کے ترجمہ کی مہم اس کے سپرد کی تھی، اور اس کو ترجمہ کے کام کا نگراں مقرر کیا تھا، معلوم یہ ہوتا ہے کہ اس کے اسی عہدے نے اس کو عہد اسلامی کے ماہر ترین ترجمہ نگاروں میں شمار کرایا۔ (۳)

۴- ابومحمد سہل بن ہارون (متوفی ۲۱۵، اور بقولے دیگر ۲۴۴ھ): اس کو مامون نے بیت الحکمت کا کاتب، اور کتابوں کا خازن مقرر کیا تھا، اس نے متعدد کتابیں تصنیف کی تھیں، منجملہ ان کے

(۱) اخبار الحکماء للقفطی: ۲۵۵ (۲) عیون الانباء: ۱۴۳/۲
(۳) ایضاً: ۱۶۰/۲

''سیرۃ المامون'' نامی کتاب تھی، اس کی نسبت ابن الندیم نے لکھا ہے کہ وہ دور اندیش، زبان آور اور سخن ور تھا، فصاحت اور شعر و سخن سے متعلق اس کی بہت سی تصانیف تھیں، جاحظ اس کو بہت اہمیت دیتا تھا، اور اس کی فصاحت و بلاغت کی تعریف و توصیف کرتا تھا، اور اپنی کتابوں میں اس کا کلام نقل کیا کرتا تھا، وہ پہلا شخص تھا جس کو بیت الحکمت کا مدیر یا ڈائریکٹر مقرر کیا گیا تھا۔(۱)

۵- سَلَم، یا صحیح تر سلمان، ملقب بہ ''صاحب بیت الحکمت'': اصلاً فلسطین کے شہر حران کا باشندہ تھا، فارسی سے عربی کے نقل و ترجمہ میں سہل بن ہارون کا شریک کار تھا، اور ان افراد میں تھا جن کو قدیم کتابوں کے انتخاب کے لیے ملک روم کے سفر پر بھیجا گیا تھا۔(۲)

۶- سعید بن ہارون (کاتب): بیت الحکمت میں سہل بن ہارون کا شریک کار تھا، ترجمہ کی ذمہ داری انجام دیتا تھا، عربی زبان کے فصیح و بلیغ لوگوں میں تھا، اس کی نسبت ابن الندیم نے لکھا ہے کہ ''فصیح و بلیغ اور نثر نگار تھا، اس کا کلام جاحظ بھی نقل کرتا ہے''۔(۳)

۷- احمد بن محمد: اس کے بارے میں ''لسان المیزان'' میں مذکور ہے کہ وہ ''صاحب بیت الحکمت'' تھا، دارقطنیؒ نے ان کے بارے میں فرمایا ہے کہ: ''امام مالک (متوفیٰ ۱۷۹ھ = ۷۹۵ء) سے حدیث روایت کی ہے، اور ان سے علی بن محمد مخزومی نے حدیث لی ہے''۔(۴)

۸- ابوحسان (صاحب بیت الحکمت): بطلیموس کی مجسطی کو عربی میں منتقل کیا تھا، مگر ایک دوسرے قول کے مطابق اس کو عربی میں حجاج بن مطر نے منتقل کیا تھا۔(۵)

۹- حجاج بن مرارضی، مسمی بہ (صنوبری): ''صاحب بیت الحکمت'' کے نام سے جو لوگ مشہور ہوئے، ان میں یہ آخری شخص تھا۔(۶)

۱۰- حجاج بن یوسف بن مطر: اس کو مامون نے قلمی کتابوں کی تحصیل اور بہم رسانی کے لیے ملک روم بھیجا تھا، اس کو ریاضی کی کتابوں کے ترجمہ میں کمال حاصل تھا، اس لیے کہ اس نے ''اقلیدس'' اور ''اصول ہندسہ'' نامی کتابوں کا دو دفعہ ترجمہ کیا، پہلی دفعہ ہارون رشید کے زمانے میں، اس ترجمہ کو

---

(۱) معجم الادباء: ۲۵۸/۴ (۲) الفہرست: ۱۷۴
(۳) ایضاً: ۱۲۰ (۴) تاریخ علماء المستنصریۃ: ۴۴۷
(۵) کشف الظنون: ۳۸۰/۲ (۶) دور الکتب العربیۃ، لیوسف العش: ۱۷

ہارون کی طرف نسبت کرتے ہوئے ''ہارونی'' کہا جاتا ہے، اور دوبارہ مامون کے زمانے میں جو مامونی کے نام سے مشہور ہوا۔ (۱)

۱۱- ابوزکریا یوحنا بن الطریق: مامون کے عہد میں امین ترجمہ مقرر ہوا، (امین ترجمہ رئیس المترجمین کا لقب ہوا کرتا تھا)، اس کو طبی کتابوں کے ترجمہ کا اہتمام تھا، مامون نے کتابوں کی حصول یابی کے لیے شاہ روم کے پاس جو وفد روانہ کیا تھا، اس کے ارکان میں ایک یہ بھی تھا۔ (۲)

۱۲- یحییٰ بن منصور موصلی: بیت الحکمت کے خازنوں میں سے ایک تھا، اور ان مشہور لوگوں میں تھا جن کو فلکیات سے خاص اشتغال تھا، ان لوگوں میں تھا جو بیت الحکمت کے نگراں تھے، مگر ان کا کوئی خاص لقب نہیں تھا۔ (۳)

۱۳- ابوجعفر محمد بن موسیٰ خوارزمی، دور مامونی کے رئیس بیت الحکمت: اصلاً خوارزم کا تھا، خزانۃ الحکمت میں گوشہ نشیں تھا، ''السند ہند کبیر'' نامی کتاب کا اختصار کیا تھا۔ (۴)

۱۴- ابویعقوب اسحاق بن حنین بن ابی زید عبادی: فن طب میں شہرت رکھتا تھا، یونانی سے عربی میں بہت سی کتابوں کا ترجمہ کیا، ترجمہ کے علاوہ اس کی اپنی بھی متعدد تصانیف فن طب پر ہیں، ۲۹۸ھ یا ۲۹۹ھ میں انتقال کیا۔ (۵)

۱۵- حبیش بن الحسن الاعسم: سربرآوردہ طبیبوں اور ماہر انجینئروں میں تھا، طب میں حنین بن اسحاق کا شاگرد اور طور طریق میں اس کے نقش قدم پر تھا، اس نے طب میں کتاب ''المسائل'' کی تکمیل کی، جس کو اس کے استاذ حنین نے طلبہ کے لیے شروع کیا تھا، اس نے متعدد کتابیں تصنیف کی تھیں، جیسے: ''اصلاح الأدویة المسهلة''، کتاب ''الأدویة المفردة'' کتاب ''الأغذیة'' اور کتاب ''الاستقاء'' وغیرہ، (۶)

۱۶- ثابت بن قرۃ بن ہارون حرانی، اس کو زہرون بھی کہا جاتا تھا: ۲۱۹ھ = ۸۳۴ء میں پیدا ہوا، نجران کا ایک صرّاف تھا، پھر وہاں سے رحلت کر کے کفر ثوبا میں اقامت گزیں ہوا، جہاں اس کی

(۱) الفہرست: ۳۷۱
(۲) طبقات الاطباء لابن جلجل: ۶۷
(۳) اخبار الحکماء للقفطی: ۴۴۱
(۴) طبقات الامم لصاعد الاندلسی: ۱۰۲
(۵) وفیات الاعیان: ۲۰۵/۱
(۶) عیون الأنباء: ۲۷۰/۶، الفہرست: ۲۹۷

ملاقات اسلامی تاریخ کے ایک ماہر مترجم محمد بن موسی خوارزمی سے ہوئی، ثابت نے ''اقلیدس'' کی -جس کی تعریب حنین بن اسحاق نے کی تھی- تہذیب وتنقیح کی، ثابت نے مختلف علوم وفنون میں تقریباً بیس کتابیں تصنیف کیں، اور اسی پر بس نہیں کیا، بلکہ اپنے پیش رو بعض اہل علم کی تصانیف کے جمع وترتیب کی خدمت بھی انجام دی، ۲۸۸ھ میں اس کی وفات ہوئی۔ (۱)

۱۷- فرزندان موسی بن شاکر (یہ محمد، احمد اور حسن ہیں): ریاضی اور علم الفلک میں اشتغال کے لیے مشہور ہیں، ان لوگوں نے اپنے مشن کی تکمیل کے لیے بیت الحکمت میں گوشہ نشینی اختیار کر رکھی تھی، ان کے والد موسی بن شاکر علم ہندسہ میں فائق تھے، اور موسی کے یہ لڑکے ماہر ہندسہ وفلکیات تھے، انھوں نے کچھ ایسی چیزیں اختراع کی تھیں، جو ان سے پہلے کسی کے حصے میں نہیں آئی تھیں، یہ بھی ان لوگوں میں تھے، جنھوں نے ملک روم سے کتابیں دریافت کیں، اور علم ہندسہ، ریاضی اور طب وغیرہ سے متعلق بہترین کتابیں اور عجیب وغریب تصانیف وہاں سے لائے۔ (۲)

۱۸- ابن ابی الحریش: مامون کے خزانۃ الحکمت میں تجلید کا کام کیا کرتا تھا۔ (۳)

۱۹- یعقوب بن اسحاق الکندی (متوفی ۲۵۶ھ): اس کی زیر نگرانی جو لوگ ترجمہ کا کام کیا کرتے، ان کے ترجموں پر نظر ثانی اور ان کی تصحیح وتنقیح کرتا تھا۔ (۴)

ابن الندیم کی الفہرست، ابن ابی اصیبعہ کی عیون الانباء اور قفطی کی تاریخ الحکماء میں مصنفوں اور ترجمہ نگاروں کی ایک بڑی جماعت کا ذکر ملتا ہے، ان کی بڑی تعداد بیت الحکمت سے وابستہ تھی، خاص طور سے وہ اہل علم جو ہارون رشید، امین، مامون، معتصم، واثق اور متوکل کے عہد میں تھے، جس طرح ان اہل علم وفضل اور ارباب ریاست ووجاہت کی ایک فہرست نظر آتی ہے، جو اس مکتبے میں مستقل خدمت انجام دیا کرتے تھے۔

اس طرح خزانۃ الحکمت مستقل سرگرم عمل رہا، اور اپنا کردار ادا کرتا رہا، فکر کا مینارہ اور علمی وادبی سرگرمی کا مرکز رہا، اساتذہ، طلبہ، اور اہل علم وتحقیق کو سیراب کرتا رہا۔

(۱) تاریخ الادب العربی بروکلمان: ۲۱/۷/۱، عیون الانباء: ۲۸۶، کشف الظنون: ۱۵۸۴/۲

(۲) تاریخ الحکماء: ۲۰۸، عیون الانباء: ۱۴۳/۲، طبقات الامم: ۸۷

(۳) الفہرست: ۱۴ (۴) تاریخ الحکماء: ۳۶۱

حاصل کلام یہ ہے کہ یہ کتب خانہ طویل عرصے تک تالیف وترجمہ اور جلد سازی کا مرکز اور ہمہ جہت علمی کتابوں کا خزانہ رہا، جو علم ومعرفت کے تمام شعبوں سے متعلق تھیں، مزید برآں اس نے اہل علم وادب اور ارباب تصنیف وتالیف کی ایک بڑی تعداد کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا تھا، جنھوں نے عربی اور اسلامی تہذیب کے فروغ میں حصہ لیا تھا، اس طرح اگلوں کے شروع کیے ہوئے کام کی تکمیل اور اسلامی سلطنت کی زندہ وپائندہ علمی زندگی کو جاری رکھتے ہوئے یہ کتب خانہ علم ومعرفت کی اشاعت کا ایک مؤثر ذریعہ رہا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کتب خانہ بیت الحکمت متوکل علی اللہ کے بعد بے توجہی کا شکار ہو گیا، اور مرور زمانہ کے ساتھ اپنی اہمیت کھوتا چلا گیا، یہ کتب خانہ چوتھی صدی ہجری کے وسط میں بھی موجود تھا، اس واسطے کہ ابن الندیم کا زمانہ یہی تھا، اور اس نے اپنی کتاب ''الفہرست'' کی تصنیف میں اس سے استفادہ کیا تھا، یہی نہیں بلکہ چوتھی صدی ہجری کے آخر تک اس کا ہونا ثابت ہوتا ہے، اس لیے کہ ابن الندیم نے الفہرست ۳۷۷ھ میں تصنیف کی تھی، اور غالب گمان یہ ہے کہ یہ کتب خانہ پورے عہد عباسی میں موجود رہا، بلکہ اس کے بعد کی صدیوں یعنی پانچویں، چھٹی اور ساتویں صدی میں بھی باقی رہا، اور اسی اہمیت کے ساتھ باقی رہا، جیسا کہ قلقشندی نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ تاتاریوں کے حملے کے دوران بغداد کی کتابوں کو جو تباہی وبربادی لاحق ہوئی، اس سے مراد خلفاء کے کتب خانوں کی تباہی ہے، ان میں سے بیشتر کتب خانے امیر تیمور لنگ کے زمانے میں تباہ وبرباد ہوئے، جس نے دو دفعہ بغداد کو تاخت وتاراج کیا، پہلی دفعہ ۷۹۵ھ = ۱۳۹۲ء اور پھر ۸۰۳ھ = ۱۴۰۰ء میں، ان ہی یورشوں میں خزانۃ الحکمت بھی تباہی کا شکار ہو کر بے نام ونشان ہو گیا۔

## مصر کے فاطمی خلفاء کا کتب خانہ:

سب سے بڑا، عظیم الشان اور مشہور ترین کتب خانہ تھا، جس سے شمالی افریقہ کا عربی تمدن روشناس ہوا، یہ اس دار العلم یا دار الحکمت کا کتب خانہ تھا، جو فاطمی خلیفہ حاکم بامر اللہ کے ہاتھوں عالم وجود میں آیا تھا، اور اس کو علم وادب سے معمور کتب خانہ بنا دیا تھا۔

فاطمیوں نے شمالی افریقہ میں اپنی سلطنت کی داغ بیل ڈالی، پھر مشرق ومغرب میں پھیلتے

چلے گئے، اور قاہرہ کو اپنا پایۂ تخت بنایا، اس حکومت نے اپنے دور ترقی میں علم وادب پر خصوصی توجہ صرف کی، اور ان کے ان اولین بادشاہوں کے عہد میں جنھوں نے عباسی خلفاء کے ساتھ مقابلہ آرائی کی کوشش کی، تہذیب وتمدن کو بہت ترقی حاصل ہوئی، اور اس نے قاہرہ کو ایک ایسا تہذیبی وثقافتی مرکز بنا دیا، جو بغداد وقرطبہ سے مقابلہ کرتا تھا، بلکہ ان پر بھی فائق تھا۔

اس کے لیے فاطمی خلفاء نے بڑی تعداد میں کتابیں جمع کیں، اور بڑے جوش وولولہ سے ہر علم وفن کی نادر کتابیں بہم پہنچائیں، ہر جگہ سے وہاں کے اہل علم کو کھینچنے کی کوشش کی، علم وتحقیق اور درس ومطالعہ کے مراکز قائم کیے، اہل علم وادب پر بخشش وعطا اور تحائف وہدایا کی بارش کردی، ان کے کارناموں میں ایک ''دارالحکمت'' کا کتب خانہ بھی تھا، جو بحث وتحقیق اور علمی مباحثوں کا مرکز تھا۔

۱۰ / جمادی الاخریٰ ۳۹۵ھ کو شنبہ کے روز اس عظیم الشان کتب خانے کا افتتاح ہوا، یعنی اس کا قیام بغداد کے بیت الحکمت کے عرصۂ دراز کے بعد عمل میں آیا، اور بظاہر اس کے مؤسس نے بغداد کے بیت الحکمت ہی کو نمونہ بنا کر اس کو قائم کیا تھا۔

چنانچہ بیت الحکمت ہی کے انداز پر اس کی بھی عمارت اور در و دیوار کو آراستہ کیا گیا، حکام اور امراء کے خزانوں سے اس میں کتابیں منتقل کی گئیں، لکھنے پڑھنے والوں کے لیے کاغذ، قلم اور روشنائی کا انتظام کیا گیا، اور ہر کام کے لیے ملازمین کا تقرر کیا گیا۔

یہ کتب خانہ مختلف قسموں میں منقسم تھا، ایک حصہ قرآن کریم پڑھنے والوں کے لیے تھا، دوسرا حصہ فقہ پڑھنے پڑھانے والوں کے لیے تھا، کچھ حصہ نحو ولغت سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے تھا، اور کچھ حصہ طب پڑھنے پڑھانے والوں کے لیے خاص تھا۔

حاکم نے کتب خانے کے اخراجات اور اس کے اساتذہ، ملازمین اور خدام کے لیے کافی دولت جمع کردی تھی، اور اپنی ذاتی املاک کا ایک حصہ اس دارالحکمت کے لیے خاص کر رکھا تھا۔ [(۱)]

اس دارالحکمت کے آغاز قیام ہی سے اس کے اندر اس نے محاضرات اور علمی مباحث کے لیے ہال مخصوص کر دیے تھے، اور اکثر وبیشتر یہ محاضرات اور علمی بحثیں خلیفہ کی موجودگی میں اور اس کے سامنے منعقد ہوتیں۔

---

(۱) مقریزی: ۲۷۳/۲

خلیفہ کی طرف سے ہر شخص کو کتب خانے میں آنے کی اجازت تھی، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ بغیر کسی امتیاز کے مختلف طبقے کے افراد وہاں استفادہ کے لیے آتے، کوئی کتب بینی کے لیے آتا، کسی کا آنا نسخہ نویسی کے لیے ہوتا، اور کچھ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے آتے۔[۱]

حاکم بامر اللہ نے اس دار الحکمت کو خاں مسرور کے نامی مقام کے پیچھے قصر شاہی کے مغرب میں اس سے متصل تعمیر کرنے کا حکم دیا تھا۔[۲] اس نے اس کی تعمیر پر اپنی پوری دلچسپی مرکوز کر رکھی تھی، اس دار الحکمت میں ایک حصہ بطور خاص کتب خانے کے واسطے تعمیر کیا تھا، جس میں خلیفہ کے اس ذاتی کتب خانے کی کتابیں منتقل کر دی گئیں، جس کا شمار عہد اسلامی کے عظیم اور مشہور ترین ذخیروں میں تھا۔[۳]

ذخیرہ جو منتقل کیا گیا تھا، نہایت نفیس اور قیمتی کتابوں پر مشتمل تھا، اور مسبّحی کے بیان کے مطابق ہر علم وفن کی کتابیں اس میں تھیں۔[۴] عربی اور اسلامی علوم کے علاوہ قدیم علوم سے متعلق بھی بہت سی کتابیں اس ذخیرے میں تھیں۔

مذکورہ بالا ذخیرے کے علاوہ دوسرے ذخیرے بھی اس میں شامل کر لیے گئے تھے، منجملہ ان کے حاکم بامر اللہ کے والد عزیز باللہ کا ذخیرہ تھا۔ اس کتب خانے میں ۴۰ کلیکشن تھے، اور ہر کلیکشن میں ۱۸۰۰۰ کتابیں تھیں،[۵] متقدمین کی جو کتابیں اس میں شامل کی گئی تھیں، وہ اس پر مستزاد تھیں۔

اس کی تائید اس اقتباس سے ہوتی ہے جس کو مقریزی نے عز الملک محمد بن عبد اللہ مسبّحی سے اس کتب خانے کی افتتاحی تقریب سے متعلق نقل کیا ہے، اس میں لکھا ہے کہ ''معمور محلات کے ذخیرے اس کتب خانے میں منتقل کیے گئے ہیں''۔[۶]

لیکن اس کا صرف یہی ایک ذریعہ نہیں تھا، بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خرید کر اور دوسرے ذرائع سے بھی اس میں کتابیں بہم پہنچائی گئی تھیں، جیسا کہ بعد کے دور میں تصانیف وتالیفات کا بہت بڑا ذخیرہ اس میں شامل کیا گیا، حتیٰ کہ مقریزی نے اس کی نسبت لکھا ہے کہ:

''یہ کتب خانہ عجائبات روزگار میں سے ہے، اور تمام قلمروئے اسلامی میں قاہرہ کے محل سے

(۱) مقریزی: ۱/۴۵۹ (۲) صبح الاعشیٰ: ۳/۳۶۲
(۳) صبح الاعشیٰ: ۱/۴۶۶ (۴) مقریزی: ۱/۴۵۸
(۵) مقریزی: ۱/۴۰۸ (۶) ایضاً: ۲/۲۴۳

بڑا کوئی کتب خانہ نہیں ہے''۔ (۱)

اس ضمن میں اس نے اس کی عمارت، کتب خانے کی الماریاں، اور اس کی کتابوں کا احوال بھی لکھا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ فاطمی خلفاء کی دلچسپی، امہات الکتب، نادر تصانیف، مؤلفین کے ہاتھوں سے لکھی ہوئی کتابوں، مشہور خطاطوں کے ہاتھ کے لیے ہوئے نسخوں پر محیط تھی، جس کے لیے انھوں نے زر کثیر اور جہد مسلسل صرف کی تھی۔

مثال کے طور: پر روایت کیا جاتا ہے کہ ''دار الحکمت'' کا کتب خانہ صرف طب کی ۶۰۰۰ کتابوں پر مشتمل تھا، مسبحی نے لکھا ہے کہ اس میں ۱۰۰ نسخے ابن درید کی کتاب ''الجمہرۃ'' کے تھے، اور ۳۰ سے زیادہ نسخے خلیل بن احمد کی کتاب ''العین'' کے تھے، ان میں ایک نسخہ خود مؤلف کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔ (۲)

اس کے عجائبات میں یہ بھی ہے کہ اس میں ۱۲۰۰ نسخے ''تاریخ طبری'' کے تھے، اور ۲۴۰۰ نسخے قرآن کریم کے تھے، جیسا کہ اس میں بہت سی چیزیں ایسی تھیں جو مشہور خطوط کی طرف منسوب تھیں، جن میں ابن مُقلہ، علی بن ہلال معروف بہ ابن البواب، اور اس دور کے دوسرے مشہور خطاطوں کے ہاتھ کی لکھی ہوئی بہت سی چیزیں تھیں۔

اس کتب خانے کے نوادرات میں ریشم کے کپڑے پر بہت باریک بنی سے بنایا ہوا ایک نقشہ تھا، روئے زمین کے اقالیم، اس کے پہاڑوں، سمندروں، شہروں اور دریاؤں کی بھی اس میں ایک تصویر تھی۔ (۳)

کہا جاتا ہے کہ اس میں پیتل کا ایک گلوب Globe تھا، جس پر ایک عبارت کندہ تھی، اس عبارت کا حاصل یہ ہے: کہ یہ گلوب خالد بن یزید بن معاویہ کی ملکیت میں رہ چکا ہے۔ (۴)

اس کتب خانے کے حجم اور اس کی کتابوں کی تعداد سے متعلق روایتیں مختلف ہیں، ایک بیان کے مطابق یہ کتب خانہ تقریباً دو لاکھ کتابوں پر مشتمل تھا۔ (۵)

ایک دوسرے بیان کے مطابق اس میں سولہ لاکھ کتابیں تھیں، اور ابوشامہ نے اس تعداد کو

---

(۱) مقریزی: ۱/۴۳۸ (۲) ایضاً: ۱/۴۰۸

(۳) ظہر الاسلام: ۱/۱۹۹ (۴) المکتبات فی الاسلام: ۱۰۲

(۵) مقریزی: ۱/۴۰۹

بیس لاکھ تک بڑھایا ہے۔[1] یہ اس کے انتہائے عروج واقبال کا زمانہ تھا۔ یہ تعداد خواہ صحیح ہو یا اس میں مبالغہ سے کام لیا گیا ہو، مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ جس دور اور ماحول میں یہ کتب خانہ قائم کیا گیا تھا، اس کو دیکھتے ہوئے یہ تعداد بہت زبردست ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مقریزی نے اس کو دنیا کے عجائبات میں شمار کیا ہے، اور اس تعبیر سے اس کو عہد اسلامی کا سب سے بہترین کتب خانہ قرار دیا ہے، اور قلقشندی کی اس رائے سے اختلاف کیا ہے، جس میں اس نے اس کو عہد اسلامی کے تین بڑے کتب خانوں کے ضمن میں شمار کیا ہے۔

اس کتب خانے کے متعلق پوپ سلفسٹر وس دوم، پاپائے روم (۹۹۹ء) نے کہا تھا کہ:

''یہ بات معلوم ہے کہ پورے سلطنت روما میں کسی کے پاس اتنا علم نہیں تھا، جس کی بدولت وہ اس کتب خانے کا دربان بننے کے قابل ہوتا، ہم لوگوں کو پڑھا کیسے سکتے ہیں، حالانکہ ہم خود اس کے محتاج ہیں کہ کوئی ہم کو تعلیم دے، اگر کسی کے پاس کوئی چیز نہ ہو تو وہ اس کو کسی دوسرے کو کیسے دے سکتا ہے''۔[2]

مطالعہ واستفادہ کرنے والوں کی سہولت کے لیے یہ کتب خانہ بہت منظّم، مرتب اور آراستہ تھا، ابن الطّویر نے اس کے تذکرے میں اس کی کتابوں کی ترتیب اور نظم وضبط کی طرف اشارہ کیا ہے۔

اس کتب خانے کے عہدے داروں میں ایک امین ہوا کرتا تھا، جس کو ''خازن'' کہا جاتا تھا، جو اس کی اشیاء اور ملازمین کا نگراں ہوتا تھا، اس منصب پر سب سے پہلے مشہور نعمانی خاندان کے ایک فرد قاضی عبدالعزیز کا تقرر ہوا تھا، یہ خاندان وہ تھا جس نے عرصۂ دراز تک فاطمیوں کی خدمت کی تھی، اس کے بعد اس کی نگرانی کی ذمہ داری وزیر ابوالقاسم علی بن احمد جرجانی -متوفی ۴۳۶ھ = ۱۰۴۵ء- کے سپرد ہوئی، اس وزیر نے کتب خانے میں بہت دلچسپی لی، اس کی مرمت کرائی، اور اس میں ضروری اصلاحات کرائیں۔

اس نے کتب خانے کی ایک عام فہرست بنانے کا حکم دیا، اور یہ اہم علمی خدمت قاضی

(۱) کتاب الروضتین: ۱/۲۰۰

(۲) شمس العرب تسطع علی الغرب، لزغرید ہونکہ: ۳۵۳-۳۵۴

ابوعبداللہ قضاعی اور ابن خلف وراق کے سپرد کی۔

دارالحکمت کا یہ کتب خانہ دوسرے کتب خانوں سے ممتاز تھا، اس کتب خانے سے استفادہ کی دو نوعیت تھی۔

ایک: خارجی، جو محل شاہی کے خارجی ذخیروں سے وابستہ تھی، جس میں عام لوگوں کو داخلے کی، اس کی کتابوں کے مطالعہ اور اس کے مراجع سے فائدہ اٹھانے کی اجازت تھی۔

دوسری نوعیت: داخلی تھی، چنانچہ اس میں داخلہ اور اس کی کتابوں سے استفادہ ائمہ، واعظین، فقہاء، اور ان جیسے لوگوں کے علاوہ کو اجازت نہیں تھی۔

یہ تھا فاطمیوں کا کتب خانہ- جیسا کہ بہت سے معاصر مؤرخین نے اس کو اسی نام سے ذکر کیا ہے- اور جیسا کہ متقدمین کی نقشہ کشی سے ظاہر ہوتا ہے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے مؤسس نے بغداد کے بیت الحکمت کو نمونہ بنا کر اس کو سامنے اور نظر میں رکھتے ہوئے اس کا ''دارالعلم'' یا ''دارالحکمت'' نام رکھا تھا۔ ''دار'' کا لفظ ''بیت'' کے لفظ کے قائم مقام ہے، اور اس کے واسطے مؤسس نے ایک مستقل اور مخصوص عمارت تعمیر کی جو واقعی لفظ ''دار'' کے استعمال کی مستحق تھی۔

نام میں مشابہت کے ساتھ ان دونوں کی سرگرمیوں اور علم وفن کے ہر شعبے میں ماہر علماء کے تقرر میں بھی مشابہت تھی، چنانچہ دونوں کتب خانوں میں خلیفہ کی موجودگی میں اور کتب خانے کے اندر علمی مباحثے اور مذاکرے ہوا کرتے۔

اسی لیے بعض مؤرخین نے اس کو بغداد کے بیت الحکمت کا توسعہ Extention خیال کیا ہے، کیونکہ دونوں کے درمیان واضح مشابہت تھی، اور وہ تمام اوصاف وخصوصیات جو بغداد کے بیت الحکمت کی شان تھیں، وہ یہاں بھی پائی جاتی تھیں، بجز ترجمہ کے، کہ وہ بیت الحکمت کا طغرائے امتیاز تھا، اور اس میں اس کی کوئی نظیر نہیں تھی۔

یہ کتب خانہ روز افزوں ترقی کرتا رہا، اگرچہ درمیان میں کچھ ایسے وقفے آئے کہ اس کے اپنے افراد اور وہاں آنے جانے والوں کی باہمی رنجشوں اور آویزشوں کی وجہ سے اس کو بند کرنا پڑا، جس سے مجبور ہو کر ۵۱۳ھ میں الملک الافضل نے لڑنے والوں کی گرفتاری اور ان کو قید کرنے کا حکم دیا، یہی وہ واقعہ ہے جس کا مقریزی نے ''نوبۃ القصار'' کے نام سے ذکر کیا ہے۔

الملک الافضل کی وفات کے بعد خلیفہ آمر باحکام اللہ نے اپنے وزیر مامون ابن البطائحی کو مکتبہ کھولنے اور اس کی نگہداشت کا حکم دیا، یہ ربیع الاول ۵۱۷ھ = مئی ۱۱۲۳ء کی بات ہے، اس سے گو کتب خانے کو نشأۃ ثانیہ مل گئی، مگر یہ دوسری زندگی زیادہ دنوں تک نہیں رہی، اس کا سبب یہ ہوا کہ یہ بیش بہا دارالحکمت جس پر خلافت فاطمیہ کے دارالحکومت کو ناز تھا؛ فتنوں، جنگوں اور شورشوں کی آماجگاہ بن گیا، جس میں کتابوں کے بہت سے مجموعے ضائع اور برباد ہوگئے۔

۵۶۷ھ = ۱۱۷۱ء میں صلاح الدین کا قاہرہ میں دخول ہوا، تو انھوں نے فاطمی خلافت کو تحلیل اور دارالحکمت کو منہدم کردیا، اس کی جو کتابیں اہل سنت کے مذہب کے خلاف تھیں ان کو فنا کردیا، اور اس کی جگہ شافعیوں کا ایک مدرسہ تعمیر کیا۔

اس کی کچھ کتابیں اپنے لوگوں میں تقسیم کردیں (چنانچہ قاضی فاضل کو ایک لاکھ کتابیں دیں)، اور باقی جو کتابیں تھیں ان کو کتابوں کے ایک ماہر کے ہاتھ کھلے عام نیلام کرادیا۔ یہ نیلامی ہفتے میں دوبار ہوتی تھی، اور بہت سستے داموں پر بیچی جاتی تھیں، اس طرح کئی سال تک ان کتابوں کی فروخت ہوتی رہی۔

جو کتابیں عہد غلاماں تک باقی رہیں، تو اس کو طلبہ نے ۱۳۴۸ء اور ۱۳۴۹ء کے اس قحط میں بیچ دیا، جس نے مصر کی جڑ اکھاڑ کر رکھ دی تھی۔

اس طرح فاطمی حکومت کے خاتمے کے ساتھ ہی یہ کتب خانہ بھی اپنے انجام کو پہنچ گیا، فاطمیوں نے ہی اس کو قائم کیا، انھوں نے دنیا کے مختلف حصوں سے اس کے لیے بیش قیمت کتابیں اور نادر مخطوطات فراہم کیے، اس کی حفاظت کا انتظام کیا، ان کے انحطاط کے ساتھ یہ اور قصر شاہی کے دوسرے کتب خانے بھی انحطاط پذیر ہوگئے، اور جب ان کو زوال آیا، تو یہ کتب خانہ بھی صفحۂ ہستی سے مٹ گیا۔

(جاری ہے)

# ’غدر سے پہلے کی ایک عجیب ہستی‘
# ملا عبدالرحیم گورکھپوری

ڈاکٹر عبدالمعید صاحب، کھیری باغ روڈ، مئو

’’مورخہ ۲۱/ جون ۲۰۱۵ء کے روزنامہ سہارا سنڈے میں عبدالباقی خاں حاصل کا معلومات افزا مضمون بعنوان ’’عبدالرحیم دہریہ گورکھپوری‘‘ شائع ہوا، ذیل کا مضمون اسی گمنام عظیم شخصیت سے متعلق بحوالہ کتب مزید مفید معلومات پر مشتمل ہے‘‘

**مولانا ابوالکلام آزادؒ فرماتے ہیں:**

یہ ان لوگوں میں ہیں جنھوں نے غدر سے پہلے محض اپنی رسائی ذہن وفکر سے دنیا کا انقلاب محسوس کیا، اور نئے علوم سے آشنا ہوئے، نیز یورپ کی زبانیں سیکھیں اور اس حد تک قابلیت حاصل کی، جو آج باوجود نئی تعلیم کے عموم ورواج کے کمیاب ہے۔

(ابوالکلام کی کہانی خود ان کی زبانی ص۲۹۲)

صاحب نزہۃ الخواطر مولانا سید عبدالحی رائے بریلویؒ نے آپ کا تذکرہ ان پرشکوہ الفاظ سے شروع کیا ہے:

**الشیخ الفاضل العلامة عبدالرحیم بن مصاحب علی الگورکھپوری أحد العلماء المبرزین فی العلوم الحکمیة** (نزہۃ الخواطر جلد۷، ص۲۸۸)

شیخ فاضل علامہ عبدالرحیم بن مصاحب علی گورکھپوری علم فلسفہ کے ایک ممتاز عالم ہیں۔

**محدث ومورخ مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ تحریر فرماتے ہیں:**

علامہ شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کے شاگرد، ادیب کامل اور متبحر عالم تھے، جب کلکتہ پہنچے تو انگریزی سیکھنا شروع کیا، تھوڑے ہی دنوں میں اتنی استعداد پیدا کرلی کہ بہ سہولت تمام انگریزی سے عربی اور فارسی میں ترجمہ کرلیتے تھے، بہت کتابیں اور رسالے تصنیف کیے۔

(دست کار اہل شرف ص۶۷)

مولانا اسماعیل شہیدؒ کے ہم درس ہیں (ابوالکلام کی کہانی ص۲۹۳)

مولانا آزادؒ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں:

............کہ نانا مرحوم جب شاہ صاحب سے پڑھنا ختم کر چکے تھے تو یہ نئے نئے درس میں شریک تھے، لیکن اس وقت بھی ذہانت اور طباعی کا یہ حال تھا، کہ شاہ صاحب کے حلقہ تلامذہ میں جو اس وقت علمی جماعتوں کا خلاصہ وعطر تھا، کوئی شخص ان کی ٹکر کا نہ تھا، معقولات کے حافظ تھے اور ہنگام درس ایسے ایسے اعتراضات کرتے اور ایسے ایسے نکتے اور پہلو تراشتے کہ شاہ صاحب کو بھی اعتراف کرنا پڑتا تھا۔ (ایضاً ص۲۹۸)

## فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں بحیثیت مدرس:

کلکتے میں نیا نیا فورٹ ولیم کالج قائم ہوا تھا، اس میں بحیثیت مدرس ملازم ہو گئے اور ڈاکٹر مارٹن وغیرہ، جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے میں ہندوستان کے یورپین علماء میں بہت ممتاز لوگ تھے، اور فارسی کی بھی اچھی استعداد رکھتے تھے، ان کی صحبت رہی، اس وجہ سے نئے علوم کا بھی شوق ہوا، اور انگریزی ولاطینی (جو اس وقت یورپ کی کلاسیکل زبان ہونے کی وجہ سے ضروری سمجھی جاتی تھی) سیکھی۔ (ابوالکلام کی کہانی ص۲۹۳) فورٹ ولیم کالج ۱۸۰۰ء میں قائم ہوا اور ۱۸۳۰ء میں بند کر دیا گیا۔

## زبان دانی اور جامعیت:

انگریزی میں ایسی عمدہ استعداد پیدا کر لی تھی کہ مشہور ہے پردے کے دوسری جانب وہ بٹھا دیے جاتے تھے اور انگریزی میں تقریر کرتے تھے اور اس طرف بڑے بڑے قابل انگریز بیٹھے تھے اور مقرر کی شخصیت کی نسبت دھوکا کھا جاتے۔ سب کہتے کہ یہ یقیناً کوئی انگریز بول رہا ہے۔ ان کا لب ولہجہ اس درجہ فصیح اور مثل اہل زبان کے تھا۔ ساتھ ہی لیٹن بھی اسی فصاحت سے بولتے تھے۔ عربی فارسی، ترکی، پشتو، اور ہندوستان کی زبانوں میں بھی یہی حال تھا۔

ایک مجلس میں کئی عرب، ایرانی، افغانی جمع ہو گئے تھے، اس کا حال صاحب ''تحفۃ العالم'' نے لکھا ہے۔ وہ ایک ہی مجلس میں عرب سے بالکل عرب کی طرح، ایرانی سے (یعنی مصنف ''تحفۃ العالم'' سے) بالکل ایرانی لب ولہجہ میں، انگریز سے ٹھیک ایک انگریز کی طرح اور افغانی سے ایک افغانی کی طرح باتیں کرتے تھے، اور تمام مجلس کا یہ حال تھا کہ نقش تصور تھی! والد مرحوم بھی نقل کرتے

تھے کہ ان کی عربی وفارسی تقریر ایسی فصیح ہوتی تھی کہ شاید ہی کسی ہندوستانی کی ہوگی۔

(ایضاص۲۹۴-۲۹۳)

## علوم جدیدہ کے داعی:

لوگ یہ سن کر تعجب کریں گے کہ سرسید سے بہت پہلے مسلمان علماء میں انگریزی زبان اور نئے علوم کی ترویج کے کتنے ہی حامی و دعاۃ گزر چکے ہیں، مولوی عبدالرحیم ان سب میں مقدم ہیں، ان کا زمانہ تو لارڈ میکالے کا زمانہ ہوگا، تقریباً اسی زمانے میں لارڈ میکالے نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی قدیم پالیسی سے اختلاف کیا، اور اپنی مشہور تاریخی یادداشت پیش کی، جس میں قدیم مشرقی السنہ وعلوم کی جگہ انگریزی زبان اور نئے علوم کی ترویج پر زور دیا تھا۔ مجھے ایک رسالہ مولوی عبدالرحیم کا فارسی میں ملا ''عرض داشت در باب ضرورت ترویج زبان انگریزی وعلوم فرنگ'' یہ دراصل ایک سوال کا جواب ہے، جو اس وقت حکام نے تعلیم کے باب میں شائع کیا تھا۔ مقصود اس سے یہ ہوگا کہ جہاں تک ممکن ہو، اہل ہند کی خواہشیں بھی اس باب میں معلوم کی جائیں۔

اس وقت ان مسائل کا کون محسوس کرنے والا تھا، لیکن ہندوؤں میں راجہ رام موہن رائے اور مسلمانوں میں مولوی عبدالرحیم، دو شخص کلکتے میں تھے، جنھوں نے اس پر توجہ کی، راجہ رام موہن رائے کی عرض داشت بنام لارڈ وارن ہسٹنگز مشہور ہے۔ لیکن مولوی عبدالرحیم کا حال لوگوں کو معلوم نہیں۔ انھوں نے انگریزی زبان اور نئے علوم کی تحصیل وترویج کے موضوع پر ایسی جامع بحث کی ہے، جیسی کہ اب کی جاسکتی ہے۔ تمام وجوہ ودلائل ہندوستان کی قسمت، انگریزوں سے وابستہ ہوچکی ہے، اور وہ وقت دور نہیں کہ تمام بقیہ حصص بھی کابل تک انگریزوں کے قبضے میں آجائیں گے۔

ایک عمدہ بات یہ ہے کہ انگریزی کی ضرورت پر صرف علمی حیثیت سے نظر ڈالی ہے، اور صرف اس لیے ہندوستانیوں کے لیے اسے ضروری سمجھتے ہیں کہ علوم میں انقلاب ہو چکا ہے، علوم قدیمہ اب تحقیقات جدیدہ کے مقابلے میں تقویم پارینہ کا حکم رکھتے ہیں، اور ہندوستانیوں کے لیے بھی ترقی وتقدم کی صرف یہی ایک راہ ہے کہ ان علوم کی تحصیل کریں۔

یہ بھی لکھا ہے کہ مسلمانوں نے یونانی علوم اپنی زبان میں منتقل کر لیے تھے، لیکن اب ایسا ممکن نہیں ہے، اس لیے کہ اول تو اس وقت حکومت تھی، جواب مفقود ہے۔

ثانیاً یونانی علوم ایک خاص حد تک پہنچ کر اور مدون ہو کر ختم ہو چکے تھے، جن کا انتقال ممکن تھا۔ لیکن یورپ کی تحقیقات جاری ہیں اور محدود ذخیرہ نہیں، جو منتقل کرلیا جا سکے۔ سائنٹفک سوسائٹی کے بعد سرسید کی بھی سب سے بڑی دلیل، انگریزی زبان کی تحصیل وترویج کے لیے یہی تھی۔ رسالے میں خطاب لارڈ وارن ہسٹنگز سے ہے۔

(ابوالکلام کی کہانی ص۲۹۶-۲۹۵)

## علمی خدمات:

ریاضی وہندسے کے بہت بڑے ماہر تھے، ایک بہت ضخیم کتاب، ریاضیات میں جدید تقسیم واضافات کے ساتھ عربی میں لکھی ہے، جو فورٹ ولیم کالج پریس میں چھپی ہے اور میرے پاس موجود ہے ''جامع العلوم''۔ جامع العلوم اس لیے کہ اسی طرح تمام علوم کے ضبط کا ارادہ تھا اور شروع ریاضی سے کیا تھا۔

پرنس اعظم شاہ ابن ٹیپو سلطان کی فرمائش سے، جان مارش کلارک کی ہسٹری آف انڈیا کا نہایت ہی فصیح اور بامحاورہ فارسی میں ترجمہ کیا اور پٹسٹ مشن پریس میں بڑے اہتمام سے نستعلیق ٹائپ میں چھپی ہے۔ باوجود عربی الفاظ سے اجتناب کے اور انگریزی ترجمے کے، عبارت بڑی چست اور شگفتہ ہے۔ ایک فارسی میں پند نامہ، جس میں گلستاں کے طرز پر چھوٹے چھوٹے پند لکھے ہیں اور عربی الفاظ سے اجتناب کا التزام کیا ہے، یہ بھی چھپ گیا ہے۔

ایک رسالہ، عربی میں جر ثقیل پر ہے اور اس میں جدید علم مکانک کے اصول ضبط کیے ہیں۔ مکانک کی جگہ منجنیق کا لفظ استعمال کیا ہے۔ دیباچے میں لکھا ہے کہ ہم نے عبارت کی صحت قرأۃ کے لیے انگریزی کی علامات قرأۃ استعمال کی ہیں، پھر پورے پنکچو ایشن کو نقل کیا ہے، اور میں نے ''کامے'' کا الٹا استعمال سب سے پہلے اسی میں دیکھا۔ بعد کو بمبئی میں منشی غلام محمد نے ایک رسالے میں یہ صلاح دی کہ واؤ کے اشتباہ سے بچنے کے لیے اسے منقلب کر دینا چاہئے۔ پھر سرسید مرحوم بھی اسی طرح تہذیب الاخلاق میں استعمال کرنے لگے۔ (ابوالکلام کی کہانی ص۲۹۴-۲۹۳)

ایک فارسی مثنوی، پرنس اعظم شاہ کی فرمائش سے لکھی ہے، شاہ نامے کے وزن پر ٹیپو سلطان کا معرکہ نظم کیا ہے، اس کا نام ''صولت ضیغم'' ہے، ضیغم اس مناسبت سے کہ لارڈ ڈلہوزی نے ٹیپو سلطان

کودکن کا شیر کہا تھا، ایک اور نثر میں بھی خاندان میسور کی تاریخ ملی، جس میں حیدر علی کے حالات تفصیل کے ساتھ جمع کیے ہیں اور نہایت اہتمام سے تصاویر تیار کر کے کتاب میں شائع کی گئی ہیں۔

(ایضاً ص۲۹٦)

محدث و مورخ مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ تحریر فرماتے ہیں:

شہزادہ غلام محمد پسر سلطان ٹیپو کی فرمائش پر ایک کتاب کارنامہ حیدری لکھی، جو ۱۸۴۸ء میں کلکتہ میں طبع ہوئی۔ محبوب الالباب کا مصنف لکھتا ہے کہ حیدر شاہ ٹیپو کے احوال میں کوئی تاریخ اس سے بہتر وجود میں نہیں آئی۔ (دست کار اہل شرف ص ٦۷)

مندرجہ ذیل کتابیں بھی ان کی تالیفات میں ہیں:

**سکون الشمس فی وسط العالم** کے اثبات اور قدیم ہیئت کے رد میں

**الانوار المشرقیه فی الاسرار المنطقیه**

**التالیفات التمثیلیة إلی رسالة الاسرار المنطقیة** (نزہۃ الخواطر جلد۷ ص۲۸۸)

## سلطان ٹیپو شہید کے شہزادے اور ملا عبدالرحیم:

سلطان ٹیپو شہیدؒ کے سبھی شہزادے ملا عبدالرحیم کے معتقد تھے (سیرت سید احمد شہیدؒ حصہ اول ص۳۳٦) شہزادوں کا ملا عبدالرحیم سے شاگرد اور استاد کا تعلق تھا (ایضاً ص۳۳۷) جانبین کا یہ تعلق اخیر تک باقی رہا، کیوں کہ کارنامہ حیدری جو سلطان ٹیپو شہیدؒ اور ان کے والد کے حالات پر مشتمل ہے، شہزادہ غلام محمد پسر سلطان ٹیپو شہیدؒ کی فرمائش پر ہی ملا عبدالرحیم نے لکھی تھی جو ۱۸۴۸ء میں کلکتہ میں طبع ہوئی۔

یہاں وقائع احمدی، میں درج اس قول کی تردید ہوتی ہے جو سلطان ٹیپو شہیدؒ کے شہزادوں کی طرف منسوب کیا گیا ہے کہ ''ان شاہ زادوں نے ملازموں سے تاکید کی کہ عبدالرحیم یہاں نہ آنے پائے''۔ (سیرت سید احمد شہیدؒ حصہ اول ص۳۴۰)

یہ ۱۸۲۱ء کی بات ہے جب سید احمد شہیدؒ اور مولانا اسماعیل شہیدؒ کلکتہ میں قیام پذیر تھے، لیکن ستائیس سال بعد ۱۸۴۸ء میں بھی شہزادوں کا ملا عبدالرحیم سے وہی اعتقاد اور شاگردی کا تعلق ہے، بڑے شہزادے کی فرمائش پر کارنامہ حیدری لکھی گئی۔

## مولانا اسماعیل شہیدؒ کی ملاعبدالرحیم سے کلکتہ میں ملاقات:

۱۸۲۱ء میں سید احمد شہیدؒ نے سفر حج کو جاتے ہوئے جب کلکتہ میں قیام فرمایا تو مولانا اسماعیل شہیدؒ نے ملاعبدالرحیم کے گھر جا کر ملاقات کی۔تقریباً چار پانچ گھنٹہ تک دونوں میں علمی گفتگو رہی۔ وہ مولانا شہیدؒ سے اس وقت سے واقف تھے جب شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کے پاس دہلی میں پڑھتے تھے۔(سیرت سید احمد شہید حصہ اول ص۳۳۷) بقول مولانا ابوالکلام آزادؒ دونوں ہم سبق بھی تھے مولانا اسماعیل شہیدؒ کی ولادت ۱۲/ربیع الثانی ۱۱۹۳ھ مطابق ۱۷۷۹ء میں ہوئی۔

مندرجہ بالا واقعہ سے اس حکایت کی تردید ہوتی ہے جو ڈاکٹر محمد جعفر نے سید صاحبؒ کے حالات میں لکھا ہے کہ مولانا اسماعیل صاحبؒ اور سید صاحبؒ کلکتہ آئے تو مولانا اسماعیل صاحبؒ نے مولوی عبدالرحیم سے ملنا چاہا، لیکن باوجود بڑی کوشش واہتمام کے یہ منھ چھپاتے رہے، مولانا اسماعیل صاحبؒ ایک دروازہ سے مکان میں داخل ہوں، تو مولوی عبدالرحیم پچھواڑے سے فرار کر جائیں۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ نے اس حکایت کو ''عجیب لطیفہ'' کے عنوان سے ذکر کیا ہے۔

(ابوالکلام کی کہانی ص۲۹۶)

## ملاعبدالرحیم کی دہریت:

بقول مولانا ابوالکلام آزادؒ:

عام طور پر یہ ''عبدالرحیم دہری'' کے نام سے مشہور ہیں، لیکن میں نے بہت جستجو کی، بجز شہرت عام کے کوئی تحریری ثبوت ان کی دہریت کا نہیں ملا، عموماً ایسا ہوتا ہے کہ جہاں ایک شخص نے شاہراہ عام کے باہر قدم اٹھایا یا مذہبی عقائد کے باب میں استدلال واحتجاج کی کوئی نئی شکل اختیار کی، یا اس کا مشرب، جیسا کہ سرسید وغیرہ کا تھا، تو عام طور پر اسے دہریت ہی کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ پس عجب نہیں کہ مولوی عبدالرحیم کا بھی یہی حال ہو، اور عقلیات کے اشغال وانہماک کی وجہ سے دہری مشہور ہو گئے ہیں، بہر حال ان کی جو تصنیفات پائی جاتی ہیں، ان میں کوئی ایسی بات نہیں ہے۔

(ابوالکلام کی کہانی ص۲۹۳-۲۹۲)

مولانا آزادؒ نے ملاعبدالرحیم کی کتابوں کا براہ راست مطالعہ کیا تھا، فرماتے ہیں:

ان تمام کتابوں میں ویسے ہی حمد ونعت طرح طرح کے اسلوب میں موجود ہیں، جیسے کہ قدیم

کتابوں کی رسم رہی ہے (ایضا! ص ۲۹۶) کسی دہریے کو اللہ وحدہ لاشریک لہ کی حمد اور 'نعت حضرت سرورعالم ﷺ' سے کیا سروکار؟

**ولادت اور وفات:**

مولانا ابوالکلام آزادؒ فرماتے ہیں: ''راجہ رام موہن رائے کی عرض داشت بنام لارڈ وارن ہسٹنگز مشہور ہے، لیکن مولوی عبدالرحیم کا حال لوگوں کو معلوم نہیں''۔ لارڈ وارن ہسٹنگز ۱۷۷۳ء سے لے کر ۱۷۸۴ء تک بنگال کے پہلے گورنر جنرل رہے، راجہ رام موہن رائے کی ولادت ۱۷۷۲ء اور وفات ۱۸۳۳ء ہے۔ ۱۸۱۳ء کے چارٹر قانون کے تحت پہلی بار ایسٹ انڈیا کمپنی نے تعلیم کے متعلق اپنی ذمہ داری محسوس کی اور ہندوستانیوں کو تعلیم یافتہ بنانے کے لیے ایک لاکھ روپیہ سالانہ کا انتظام کیا۔ اس وقت بنگال کے گورنر جنرل لارڈ ہسٹنگز تھے، وہ ۱۸۱۳ء سے لے کر ۱۸۲۳ء تک بنگال کے دوسرے گورنر جنرل رہے۔ راجہ رام موہن رائے اور مولوی عبدالرحیم ہم عصر ہیں، دونوں نے ہی اپنی اپنی عرض داشتیں انہی کے نام تحریر کی ہوں گی نہ کہ لارڈ وارن ہسٹنگز کے نام۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ سے یہاں تسامح ہوا ہے، انھوں نے غلطی سے لارڈ ہسٹنگز کے بجائے ''لارڈ وارن ہسٹنگز'' لکھوادیا ہے۔

قرین قیاس ہے کہ ملا عبدالرحیم کی ولادت بھی اٹھارہویں صدی عیسوی کے ربع اخیر کے اوائل میں ہوئی ہوگی۔

محدث ومؤرخ مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ تحریر فرماتے ہیں:

محبوب الالباب (فہرست کتب خانہ بانکی پور) ۱۳۱۴ھ میں لکھی گئی ہے، اس وقت ملا کی وفات کو تیس برس سے زائد ہو چکے تھے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ ملا کی وفات ۱۲۸۰ھ کے بعد ہوئی ہے، ملا صاحب کے جاننے والے اور ان کے اقرباء گورکھپور میں اب بھی موجود ہیں۔ (دستکار اہل شرف ص ۶۷)

محبوب الالباب عیسوی سنہ کے مطابق ۱۸۹۶ء میں لکھی گئی ہے، ملا صاحب کی وفات ۱۸۶۳ء کے بعد ہوئی ہوگی۔

# اہل علم کے خطوط بنام حضرت محدث کبیرؒ

## (مکاتیب حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ)

ترتیب: مسعود احمد الاعظمی

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

۲۸/اپریل ۷۰ء
لکھنؤ

حضرت مخدومی معظمی! دامت فیوضکم

سلام مسنون۔

خدا کرے مزاج گرامی ہر طرح بعافیت ہو۔

غالباً پرسوں ایک عریضہ ارسال خدمت کیا تھا جس میں دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے لیے سفر کی درخواست بھی کی تھی، اور سفر کے پروگرام کے بارہ میں عرض کیا تھا کہ ۳/اپریل جمعہ کی شام کو یہاں سے روانہ ہوکر شنبہ کا دن سہارنپور گزار کے دیوبند چلیں۔

بعد میں سوچا تو زیادہ مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ پنجشنبہ کو یہاں سے دہرہ ایکسپریس سے روانہ ہوکر جمعہ کی صبح ۹-۱۰ بجے سہارنپور پہنچیں اور اگلے دن شنبہ کی شام کو سہارنپور سے دیوبند پہنچیں، اس صورت میں سہارنپور کچھ قیام بھی ہوجائے گا اور جمعہ کا دن وہاں کے لیے بعض پہلوؤں سے زیادہ مناسب بھی ہوتا ہے اس لیے اب میری یہی گزارش ہے، حکیم محمد ایوب صاحب جناب کی تشریف آوری کے خاص طور سے متمنی رہتے ہیں قریباً ہر ہفتہ کی حاضری میں اس کا اظہار بھی فرمایا کرتے ہیں، بظاہر حضرت شیخ کا بھی اب آخری دور ہے اور اپنی صف کے اب غالباً وہی باقی رہ گئے ہیں۔

حضرت مولانا عبداللطیف صاحب کی خدمت میں برادرم مولوی رشید احمد صاحب بشرط

سہولت سلام مسنون پہنچا دیں اور یہ اگر مولانا بھی اس موقع پر دیو بند تشریف لے چلنے کا ارادہ فرمائیں تو سفر انشاء اللہ زیادہ پر لطف ہی نہیں بلکہ امید ہے کہ مفید بھی ہوگا۔

اس کا بھی امکان ہے کہ مولانا شاہ معین الدین صاحب بھی سہارنپور ساتھ چلیں وہ حضرت شیخ سے وابستہ بھی ہو چکے ہیں، والسلام۔

محمد منظور نعمانی

لکھنؤ سے سہارنپور تک جانے والی ٹو ٹائر میں چونکہ ریزرویشن کرانا ہوگا اس لیے اچھا یہ ہے کہ تار سے یا ٹیلیفون سے مطلع فرمادیا جائے۔ میرا نمبر ۲۵۵۴۷ ہے، والسلام آخراً

.....................................

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

لکھنؤ

۲۲ رمئی ۷۰ء

حضرت مخدومی معظمی! دامت فیوضکم

سلام مسنون۔

۱۰ رمئی کو دارالعلوم کی مجلس عاملہ کا جلسہ تھا وہاں سے واپسی پر گرامی نامہ مورخہ ۹ رمئی دیکھ سکا، افریقہ کے خط کا حال معلوم کر کے خوشی ہوئی، اللہ تعالیٰ جلد سے جلد اس کام کی تکمیل فرمادے، میرے نزدیک بھی یہ بات مشکل ہے کہ آپ اتنی طویل مدت کے لیے اتنا لمبا سفر فرمائیں، دوسری طرف یہ بھی واقعہ ہے کہ ہندوستان میں اگر طباعت کا اہتمام کیا جائے تو مشکلات بھی بہت پیش آئیں گی اور کئی برس لگ جائیں گے اور کتاب کی نکاسی اور افادیت بھی محدود ہوگی اس لیے میرے نزدیک مناسب یہ ہوگا کہ آپ ایک رفیق اور خادم کے ساتھ ہوائی سفر منظور فرمالیں، قاہرہ تو میرا جانا نہیں ہوا لیکن بیروت تو صحت اور موسم کے لحاظ سے شاید دنیا کی بہترین جگہوں میں ہے۔ اگر جی لگے اور صحت ساتھ دے تو کام کے اختتام تک قیام فرمالیا جائے، ورنہ میرے خیال میں ایسے آدمی قاہرہ اور بیروت دونوں جگہ دستیاب ہو جائیں گے جو کچھ دنوں تک جناب کی نگرانی اور رہنمائی میں کام کرنے کے بعد باقی کام کو خود تکمیل تک پہنچادیں، اس صورت میں ۴-۶ ہفتے سے زیادہ قیام کی انشاء اللہ ضرورت نہ ہوگی، اگر

برادرم مولوی رشید احمد صاحب ساتھ جائیں تو یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جناب ان کو وہاں چھوڑ کر تشریف لے آئیں، بہرحال میری رائے ہے کہ اگر اس کام کے لیے سفر ضروری ہو تو بنامِ خدا کرلیا جائے۔ دعا کا محتاج وطالب ہوں، والسلام۔

محمد منظور نعمانی

اگر ''العقد الثمین'' کی جلدی ضرورت ہو تو یہ ہوسکتا ہے کہ کسی آنے جانے والے کے ذریعہ میں اس کی پوری جلدیں روانہ خدمت کردوں۔

.....................................

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

لکھنؤ

۱۲/جون ۷۱ء

حضرت مخدومی معظمی! دامت فیوضکم

سلام مسنون۔

گرامی نامہ نے مشرف فرمایا، خدا کرے مزاج گرامی بعافیت ہو مولوی عبدالحق صاحب سلمکی مئو سے واپسی پر یہاں بھی تشریف لائے تھے اور بتلایا تھا کہ ۲۰/جون کے بعد تشریف لے جانے کا فیصلہ فرمایا ہے

ہفتہ عشرہ ہوا ہوگا پاسپورٹ ترکی کے اضافہ کی درخواست کے ساتھ داخل کردیا گیا تھا، اس وقت انھوں نے لے جانے والے صاحب سے کہا تھا کہ ۱۱/جون جمعہ کو لے جائے گا۔ چنانچہ کل وہ گئے تو کہا کہ ابھی تو نہیں ہوا اور درمیان میں دو دن چھٹی رہے گی اب ۱۶/جون کو آکر لے جائے گا خدا کرے ۱۶/جون کو مل جائے۔

اگر لکھنؤ ہوکر تشریف لے جانے کا پروگرام ہو تو پھر مناسب یہ ہوگا کہ پاسپورٹ یہیں رہے اور یہیں سے ساتھ لے لیا جائے لیکن اگر لکھنؤ کا پروگرام نہ ہو تو مطلع فرمادیا جائے ڈاک سے رجسٹرڈ روانہ کردیا جائے گا۔

پی، فارم دہلی سے بھی مل سکتا ہے اور بمبئی سے بھی لیکن کوئی اس راہ سے آشنا بھاگ دوڑ

کرنے والا چاہئے، یہ مشکل مرحلہ ہوتا ہے میرے نزدیک تو یہ مناسب ہوگا کہ بمبئی یا دہلی جہاں سے بھی ہوائی سفر شروع فرمانا ہو، مولوی عبدالحق صاحب سے کوئی آدمی ان کاموں کوانجام دینے کے لیے پہنچ جائیں، بعض اوقات دو دو ہفتے لگ جاتے ہیں مجھ پر گزری ہے۔

الفرقان کے تینوں شمارے انشاءاللہ روانہ ہو جائیں گے۔

میں سہارنپور نہیں جاسکا، اب طبیعت الحمدللہ ٹھیک ہے، دعاؤں کا محتاج ہوں، والسلام۔

محمد منظور نعمانی

...............................

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

لکھنؤ

۷۱/۶/۱۷ء

حضرت معظمی محترمی! دامت فیوضکم

سلام مسنون۔

میرا پہلا عریضہ ملا ہوگا، پاسپورٹ ترکی کے اضافہ کے بعد آج مل گیا ہے چونکہ جناب نے چونکہ مئو پہنچنے کے لیے تحریر نہیں فرمایا اس لیے میں نے اس کو روانہ نہیں کیا خیال ہے کہ شاید امروز فردا میں لکھنؤ تشریف آوری ہو۔ اگر مئو روانہ کرنے کے بارہ میں ہدایت موصول ہوئی تو رجسٹرڈ روانہ کر دیا جائے گا۔ ڈاک کے آخری وقت میں اس لیے نہایت عجلت میں یہ عریضہ لکھ رہا ہوں، والسلام۔

محمد منظور نعمانی

...................................

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

لکھنؤ

۷۱/۷/۱۲ء

حضرت مخدومی معظمی! دامت فیوضکم

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ۔

گرامی نامہ مورخہ ۳۰/ جون سفر سے واپسی پر کل دیکھ سکا، میں یہاں سے ۳۰/ کو سہارنپور

ودیوبند کے لیے روانہ ہوگیا تھا۔ دہلی و سنبھل ہوتا ہوا پرسوں واپس ہوسکا ہوں۔

الفرقان کے تینوں شمارے ان شاءاللہ موصول ہو جائیں گے، معلوم ہوا کہ مولوی عتیق الرحمٰن نے گرامی نامہ دیکھ کر خود ہی روانہ کرادیئے ہیں۔

.....................................

میرا خیال ہے کہ پی، فارم زیادہ سہولت سے بمبئی سے حاصل ہو سکے گا، وہاں اپنے ایسے لوگ ہیں جو برابر یہ کام کرتے کراتے رہتے ہیں، کانپور کے متعلق میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ وہاں کامیابی مشکل سے ہوتی ہے۔ لیکن ہمارے علاقہ کے لیے وہی جگہ تھی۔

اس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ جہاں سے پی، فارم حاصل کرنا ہے (کانپور یا دہلی یا بمبئی) وہاں سے ہی فارم ملتا ہے، اس کی خانہ پری کر کے داخل کردیا جاتا ہے۔ اگر کوئی کوشش کرنے والا ہوتو، ۱،۲ دن میں حاصل ہو جاتا ہے، جس ہوائی کمپنی کے جہاز سے سفر کرنا ہوتا ہے اس کے ایجنٹ بھی یہ کام کرالیتے ہیں، اس لیے میری گزارش یہ ہے کہ اگر سملک سے کوئی جواب نہیں آتا ہے تو پھر انتظار نہ فرمائیں اگر سفر کی تیاریاں مکمل ہیں، ہوائی ٹکٹ بھی آچکا ہے تو سفر سے متعلق سارے کاغذات لے کر دہلی یا بمبئی تشریف لے جائیں، جہاں سے سفر فرمانا ہو، بمبئی میں قاضی اطہر صاحب یا دوسرے بھی کوئی متعارف اس سے نبٹ لیں گے، دہلی میں اگر اور کوئی خاص آدمی نظر میں نہ ہو تو مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کے یہاں تشریف لے جائیں وہیں قیام فرمالیں، وہ اس مرحلہ کو انشاءاللہ طے کرا سکیں گے۔ وہ خود بھی سفر کرتے رہتے ہیں، اور حکومت کے لوگوں سے بھی ان کے تعلقات ہیں۔

پی، فارم حاصل ہونے کے لیے سب سے زیادہ ضرورت اس کی ہوتی ہے کہ جہاں جانا ہے وہاں کے کسی ذمہ دار کی طرف سے آپ کے مصارف کی کفالت کی مصدقہ تحریر ہو، وہاں سے بلانے کے اور تقاضے کے جو خط آئے ہوں وہ بھی ساتھ ہونے چاہیئں، دہلی یا بمبئی جہاں سے ہوائی سفر فرمانا ہو وہاں سے پی، فارم حاصل کیا جائے۔ کانپور سے بھی حاصل ہوسکتا ہے۔

بھائی رشید احمد کو سلام مسنون، والسلام علیکم ورحمۃ اللہ

محمد منظور نعمانی

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

لکھنؤ

۲/۸/۷۱ء

حضرت مخدومی معظمی! دامت فیوضکم وبرکاتکم

سلام مسنون۔

گرامی نامہ مورخہ ۳۱/۷/۷۱ء ابھی موصول ہوا۔ اتفاق سے مولوی ابراہیم میاں کو آج صبح ہی میں نے خط لکھایا ہے اس میں اس کا کچھ تفصیل سے ذکر کیا ہے کہ، مجھے معلوم ہوا ہے کہ حضرت مولانا کے پاس بیروت کا کوئی دعوت نامہ اور مصارف کا کفالت نامہ نہیں تھا جس کی وجہ سے ابھی تک پی، فارم حاصل نہیں ہوسکا ہے۔ اور جب تک یہ دو چیزیں نہ ہوں پی، فارم نہیں مل سکتا اور سفر نہ ہو سکے گا۔

میں نے یہ بھی لکھا ہے کہ آئندہ کے لیے یہ طے کر لیجئے کہ جب حضرت مولانا کا سفر ضروری ہو آپ سملک والوں کے سپرد کر دیں تو قانونی ضروریات کی تکمیل وہ کر لیا کریں اور حضرت مولانا مقررہ تاریخ پر سفر کے لیے تیار ہو کر بس بمبئی تشریف لے جایا کریں وہ حضرات بمبئی سے سفر کے انتظامات اور سارے مراحل طے کر کے رخصت کر دیا کریں، قانونی مراحل کا طے کرنا نہ حضرت مولانا کے لیے ممکن ہے نہ ان کے پاس ان کاموں کے لیے کوئی آدمی ہے۔

گرامی نامہ سے مولوی ابراہیم میاں کے تازہ خط کا مضمون معلوم کر کے افسوس ہوا۔

حاجی رئیس الدین صاحب کھیتا سرائے کے شاہ صاحب کے بھی زیر علاج رہ چکے ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ ہمارے مولانا سید منت اللہ رحمانی صاحب بھی اس میں اچھا درک رکھتے ہیں، اگر ضرورت ہوئی تو اب میں ان کی طرف رجوع کا مشورہ دوں گا۔ مولانا عبدالحفیظ صاحب سے ۴۰ سال کا تعلق تھا، بریلی میں زیادہ رہا تھا بڑے بے نفس آدمی تھے اللہ تعالیٰ مغفرت ورحمت کا خاص معاملہ فرمائے، والسلام۔

محمد منظور نعمانی

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

لکھنؤ

۶ر اگست ۷۱ء یوم الجمعہ

حضرت مخدومی معظمی! دامت فیوضکم

سلام مسنون۔

غالباً دو ہی دن پہلے عریضہ ارسال خدمت کیا ہے اس میں یہ بھی عرض کیا تھا کہ ابراہیم میاں کو میں نے خط لکھا ہے جس میں سفر میں تاخیر کی وجہ تفصیل سے لکھ دی ہے اور یہ کہ جب تک بیروت کا دعوت نامہ اور کفالت نامہ نہ ہو پی، فارم حاصل نہیں ہوسکتا اور حضرت مولانا نے دونوں چیزوں کے لیے بیروت لکھا ہے اور اس کا انتظار ہے اور غالباً اس صورت حال کی اطلاع آپ کو بھی دیدی ہوگی۔ یہ خط میں نے ان کو ۳-۴ ہی دن پہلے لکھا ہے۔

آج رات میں اس کا تار ملا جس میں صرف یہ ہے کہ

''مولانا کی روانگی کے لیے مدد کیجئے'' اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں صورتحال کا غالباً علم نہیں ہے، میرے خط سے بھی انھیں صورتحال معلوم ہوجائے گی جناب بھی ان کو مکرر لکھ دیں اچھا ہے۔ اب تو وہ دونوں چیزیں بیروت سے آجانی چاہئیں۔

پرسوں سہارنپور اور دیوبند انشاء اللہ جانا ہے ۵-۶ دن میں واپسی کا اندازہ ہے، والسلام

محمد منظور نعمانی

.....................................

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

لکھنؤ، دفتر الفرقان

حضرت مخدومی معظمی! دامت فیوضکم

سلام مسنون۔

گذشتہ جمعرات (۱۳ر جنوری) کو دارالعلوم کے ایک مسئلہ سے متعلق سب کمیٹی بلائی گئی تھی، میں بھی حاضر ہوا تھا، شنبہ تک وہیں قیام رہا، وہاں مولانا محمد ظفیر الدین صاحب نے بتایا کہ حضرت مئو تشریف فرما ہیں، مجھے حیرت ہوئی، ان کے علاوہ کوئی اور کہتا تو مجھے شبہہ ہوتا، انھوں نے یہ بھی بتایا کہ

کہ وہ دیوبند آتے ہوئے مئوحضرت کی خدمت میں حاضر ہوکر آئے ہیں، مجھے کسی ذریعہ سے ابھی تک تشریف آوری کا علم نہیں ہوسکا میں یہی سمجھ رہا تھا کہ بیروت قیام ہے یہ بھی خیال تھا کہ موسم حج پر غالباً تشریف لے جائیں گے اور شاید اس کے بعد تشریف آوری ہو۔

میں نے ارادہ کیا ہے کہ اگر کوئی مانع نہ ہوا تو کل الہ آباد صبح پہنچوں، اور کچھ وقت وہاں قیام کر کے اگر ہوسکا تو پرسوں جمعرات ہی کو یا پھر جمعہ کو حاضر ہوجاؤں، کام کچھ نہیں ہے، صرف زیارت ہی کی نیت سے سفر ہوگا۔ اور سب حضرات کی بھی زیارت ہوجائے گی، (انشاءاللہ) مجھے حاضر ہوئے کافی دن گزر چکے ہیں دعا کا محتاج وطالب ہوں، برادرم مولوی رشید احمد صاحب کو سلام مسنون،
والسلام علیکم ورحمۃ اللہ

محمد منظور نعمانی

.....................................

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

لکھنؤ

۲۶/۱/۷۲ء

حضرت معظمی محترمی! دامت فیوضکم وبرکاتکم

سلام مسنون

خدا کرے مزاج گرامی ہر طرح بعافیت ہو۔

میں گذشتہ جمعہ کو مغرب سے پہلے جامعۃ الرشاد، اعظم گڈھ پہنچ گیا تھا بس اسٹیشن پر ان کی طرف سے ایک صاحب محض بر بنائے احتیاط آ گئے تھے، میں نے ان کو وقت کی اطلاع تو دی نہیں تھی، الحمدللہ بہت سہولت سے مدرسہ پہنچ گیا، وہاں ایک صاحب مبارکپور سے آئے ہوئے تھے وہ مبارکپور کا پروگرام وقت کے تعین کے ساتھ طے کر کے واپس چلے گئے۔ اگلے دن شنبہ کو مبارکپور روانگی سے پہلے قاری ریاست علی مرحوم کے انتقال کی اطلاع مولوی مجیب اللہ صاحب کے ذریعہ مل گئی تھی، لیکن مبارکپور کے طے شدہ پروگرام کی وجہ سے میں مئو آنے کا فیصلہ نہیں کرسکا۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کے ساتھ مغفرت ورحمت کا خاص الخاص معاملہ فرمائے۔

میں پرسوں یہاں پہنچ گیا تھا، کل ڈاکٹر فریدی صاحب سے ٹیلیفون پر بات کی، انھوں نے

بتایا کہ ہفتہ عشرہ تک ان کا کوئی پروگرام سفر کا نہیں ہے، اس لیے یہ مناسب ہوگا کہ بھائی مولوی رشید احمد صاحب ۲-۴ دن میں یہاں پہنچ جائیں، میں نے ڈاکٹر فریدی صاحب سے ان کے بارے میں ذکر کر دیا ہے، یہاں کل سے سردی بڑھی ہوئی ہے، جیسے کہ کبھی سرد لہر آجاتی ہے، امید ہے کہ انشاء اللہ ۲-۴ دن کے بعد موسم میں اعتدال آجائے گا، دن میں دہرہ سے سفر کرنا غالباً مناسب رہے گا۔

دعا کا محتاج وطالب ہوں اور دعا کرتا ہوں، بھائی مولوی رشید احمد صاحب سلام مسنون قبول کریں، والسلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

محمد منظور نعمانی

..................................

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

لکھنؤ- ۱۸/۷/۷۵ء

حضرت مخدومی معظمی! دامت فیوضکم وبرکاتکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

خدا کرے مزاج گرامی ہر طرح بخیریت ہو۔

مجھے یہ عریضہ اس سے کافی پہلے لکھنا چاہیے تھا لیکن میں ایک ضرورت سے بمبئی چلا گیا تھا قریباً ۲ ہفتے کے بعد واپسی ہوئی اس لیے بہت تاخیر سے لکھ رہا ہوں۔

عرض یہ کرنا چاہتا تھا کہ دارالعلوم کی مجلس شوریٰ میں بہت مدت سے تشریف آوری نہیں ہوئی ہے اگر کوئی خاص مانع نہ ہو تو جی چاہتا ہے کہ شرکت ہو اس بہانہ سے اطمینانی ملاقات بھی نصیب ہو جائے گی شاہ گنج پر وقت کے وقت بھی دہرہ ایکسپریس میں سلیپر میں جگہ مل جانی چاہیے۔

میرا ارادہ اس دفعہ براہ دہلی دیوبند جانے کا ہے اور دہلی میں ۲ دن قیام بھی کرنا چاہتا ہوں، ارادہ یہ ہے کہ ۲۲/ جولائی کو یہاں سے روانہ ہو جاؤں ۲۴/ کی شام یا ۲۵، کی صبح کو انشاء اللہ دارالعلوم پہنچ جاؤں گا۔ دارالعلوم ہی کے ایک کام کی وجہ سے میرا ایک دن پہلے یعنی ۲۵/ کو دارالعلوم پہنچ جانا ضروری ہے۔

دعا کا محتاج وطالب ہوں۔

والسلام

محمد منظور نعمانی

لکھنؤ کی بہت مختصر ملاقات کے موقع پر میں نے ذکر کیا تھا کہ گجرات میں ایک پمفلٹ جماعت اسلامی کے عامی حضرات کی کی طرف سے گجراتی میں شائع ہوا جس میں مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کے نام سے ایک مضمون یا بیان جماعت کی واضح حمایت اور تائید میں شائع ہوا ہے۔

اس کو اردو میں منتقل کر کے میرے پاس بھیجا گیا تھا۔ میں نے مجلس عاملہ کے موقع پر مفتی صاحب سے اس کا ذکر کیا انھوں نے فرمایا کہ یہ بالکل غلط اور بے اصل ہے پھر مولانا مفتی سید عبدالرحیم صاحب لاجپوری کے خط کے جواب میں مفتی صاحب نے یہی لکھا کہ یہ بالکل جعلی ہے اس طرح کی کوئی چیز میں نے کبھی نہیں لکھی۔ الحمدللہ، حضرت تک اس کو پہنچا دینا میں نے ضروری سمجھا۔

والسلام آخراً۔

نعمانی غفرلہ

## قناعت واستغناء

ہمایوں بادشاہ نے بہت چاہا اور بار بار درخواست کی کہ قاضی خاں ظفرآبادی کوئی نذرانہ قبول فرمالیں، لیکن نہیں لیا۔ ایک دفعہ سادہ کاغذ اور شاہی مہر ونشان شیخ کی خدمت میں بھیج کر درخواست کی کہ جو موضع چاہیں اور جس مقدار میں چاہیں اس کی معافی کا فرمان ہماری طرف سے اس پر لکھ کر مہر ونشان لگالیں۔ حضرت قاضی خاں نے فرمایا کہ ہم کو حاجت وضرورت نہیں ہے اور بغیر حاجت کے مسلمانوں کا حق لینا جائز نہیں ہے، پھر ہم نے اپنے پیر کی خدمت میں عہد کیا ہے کہ:

از خدا خواہم واز غیر خدا نخواہم بخدا　　کہ نیم بندۂ غیر ونہ خدائے دیگر است

(یعنی میں خدا سے مانگوں گا، خدا کی قسم کسی دوسرے سے نہ مانگوں گا کہ نہ میں دوسرے کا بندہ ہوں نہ کوئی دوسرا خدا ہے۔)

شاہی آدمیوں نے کہا آپ لے کر اپنے لڑکوں کو عنایت فرمادیجئے، ممکن ہے ان کو حاجت ہو، فرمایا ہمارا ان پر زور نہیں ہے وہ چاہے لیں یا نہ لیں وہ جانیں، چنانچہ بڑے لڑکے عبداللہ تھے، جب ان کے سامنے لے گئے تو انھوں نے بھی قبول نہیں کیا اور فرمایا کہ لڑکے کو چاہئے کہ باپ کے قدم بہ قدم چلے، ہمارے باپ نے نہیں لیا تو ناچار ہم کو بھی وہی کرنا چاہئے۔ (اخ ص ۲۲۷)

(اہل دل کی دل آویز باتیں ص ۲۶)

وفیات
مسعود احمد الاعظمی

## مولانا الطاف احمد

یکم رجب ۱۴۳۶ھ مطابق ۲۱/اپریل ۲۰۱۵ء سہ شنبہ کو صبح کے وقت مولانا الطاف احمد معروفی کی رحلت ہوئی، مولانا مرحوم پورہ معروف کے ایک علمی و دینی خانوادے کے چشم و چراغ اور ایک باصلاحیت و جید الاستعداد عالم تھے، ان کے والد مولانا امانت اللہ معروفی ایک بلند رتبہ و باکمال عالم، کہنہ مشق استاذ و مربی، اور نہایت متواضع اور خلیق شخصیت کے حامل تھے، اور چچا حضرت مولانا نعمت اللہ معروفی کا شمار دار العلوم دیوبند کے مؤقر اساتذہ اور ہندوستان کے معروف اہل علم میں ہوتا ہے، مولانا الطاف احمد کے والد مرحوم اور عم محترم دونوں حضرات کو محدث کبیر حضرت مولانا الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ نہایت مخلصانہ وعقیدت مندانہ تعلق تھا، خاص طور سے ان کے والد تو حضرت محدث کبیر رحمۃ اللہ علیہ کے بہت معتمد علیہ لوگوں میں تھے۔

مولانا الطاف احمد صاحب عربی زبان وادب پر بڑی قدرت اور دستگاہ رکھتے تھے، اور ایک عرصے تک جمعیۃ علماء ہند کی طرف سے شائع ہونے والے عربی جریدے **الکفاح** سے وابستہ رہ چکے تھے۔ اس کے بعد وہ کئی برس تک سعودی عرب میں بسلسلۂ ملازمت قیام پذیر رہے، وہاں سے واپس آنے کے بعد پورہ معروف کی مشہور دینی درس گاہ اشاعت العلوم سے وابستگی اختیار کرلی، اور تا دمِ آخر اس کے صدر المدرسین کے منصب پر فائز رہے، پھر ایسی علالت لاحق ہوئی جس سے وہ جانبر نہ ہوسکے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مولانا مرحوم کی مغفرت فرمائے، اور ان کے درجات کو بلند فرمائے۔

.............................................

## مولانا محفوظ الرحمٰن مفتاحی

۲۵/شعبان ۱۴۳۶ھ مطابق ۱۳/جون ۲۰۱۵ء کو شام کے تقریباً چار بجے یہ افسوسناک خبر وصول ہوئی کہ تھوڑی دیر پہلے مئو کی جامع مسجد کٹرہ کے امام وخطیب اور مدرسہ مفتاح العلوم کے استاذ مولانا محفوظ الرحمٰن مفتاحی کا لکھنؤ میں انتقال ہوگیا، یہ خبر اہل شہر کے لیے برق آسا تھی، اور دیکھتے ہی

دیکھتے مولانا کے مکان کی طرف جانے والے لوگوں کی قطار بندھ گئی، اور چند ساعت بھی نہیں گزری تھی کہ ان کی رہائش گاہ کے قریب لوگوں کا ہجوم ہوگیا، شب کے تقریباً دس بجے مولانا کا جسد خاکی لکھنؤ سے بذریعہ ایمبولنس مئو لایا گیا، اور دوسرے روز یکشنبہ کو ظہر کی نماز کے بعد ان کے گھر کے قریب واقع ایک وسیع وعریض میدان میں ایک جم غفیر نے نماز جنازہ ادا کی، اور مدرسہ مفتاح العلوم کے ایک کنارے تدفین عمل میں آئی۔

مولانا مرحوم ایک دیندار اور ممتاز گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، ان کی تعلیم وتربیت اور نشو ونما میں ان کے گھریلو ماحول اور دینداری کا خاص دخل تھا، تعلیم وتربیت تمام تر مدرسہ مفتاح العلوم میں ہوئی، اور اپنے وقت کے اچھے اور ممتاز اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرکے انھوں نے علم دین کی تحصیل کی اور مفتاح العلوم ہی سے فارغ التحصیل ہوئے۔ فراغت کے بعد سے ہی درس وتدریس کا مشغلہ اختیار کیا، اور یہ سلسلہ آخر تک جاری رہا، اور ایک بڑی تعداد نے ان سے علمی استفادہ کیا۔

کم وبیش اٹھارہ برس سے وہ جامع مسجد کٹرہ کی امامت وخطابت کے منصب پر متمکن تھے، جس کی وجہ سے ان کو شہر اور اس کے اطراف میں خاصی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوگئی تھی، عوامی مقبولیت کے ساتھ ساتھ حکام رس تھے، اور شہر کے اہم اور نازک معاملات میں حکام اور انتظامیہ کے افراد ان کے اوپر اعتماد کیا کرتے تھے۔

قومی اور سماجی کاموں میں پیش پیش رہنے والے تھے، لوگوں کے دکھ درد میں شریک اور وقت پڑنے پر ان کے کام آنے والے تھے، سماجی اور معاشرتی اصلاح کے لیے کوشاں رہا کرتے تھے، محنتی، جفاکش اور مضبوط قوت ارادی کے مالک تھے، جس چیز کا عزم کرلیتے تھے، اس کی راہ میں آنے والی کسی رکاوٹ کو خاطر میں نہیں لاتے تھے، جمعیۃ علماء ضلع مئو کے سابق صدر رہ چکے تھے۔

مئو شہر کے موجودہ علماء میں دینداری اور پرہیزگاری کے لحاظ سے ممتاز تھے، طبیعت میں احتیاط کا عنصر غالب تھا، غالباً ۱۹۹۰ء کے لگ بھگ کی بات ہے کہ مدرسہ مرقاۃ العلوم کے ایک استاذ کے اچانک استعفا دیدینے کی وجہ سے حضرت محدث الاعظمیؒ کے ایما پر کچھ دنوں مشکوٰۃ شریف کا درس دیا تھا، مگر یہ ایک عارضی اور وقتی خدمت تھی، جس کی اللہ رب العزت ان کو جزائے خیر عطاء فرمائے۔

ایک عرصہ سے وہ مختلف امراض وعوارض میں مبتلا تھے، اور ان کا جسم مجموعۂ امراض ہوچکا تھا،

انتقال کے کئی مہینے پہلے سے ان کے مرض میں اضافہ ہوتا گیا، بالآخر ڈاکٹر نے ان کو لکھنؤ ریفر کیا، اور وہیں اپنے مولائے حقیقی سے جا ملے، عمر ساٹھ سال سے کم ہی رہی ہوگی، ۲۶ر شعبان =۱۴ر جون کو ظہر کی نماز کے بعد نماز جنازہ اور تدفین عمل میں آئی، جس میں پورا شہر امڈ پڑا تھا، اور اطراف سے بھی بڑی تعداد میں لوگ شریک جنازہ ہوئے تھے، ان کے چچا جناب قاری ظفر علی صاحب کی امامت میں نماز جنازہ ادا کی گئی۔

..........................................

## ایک دوسرے مولوی محفوظ الرحمٰن

ایک اور مولوی محفوظ الرحمٰن مفتاحی تھے، جو اول الذکر کے ہم سبق اور مفتاح العلوم کے فارغ التحصیل تھے، حضرت محدث کبیر کی بڑی صاحب زادی کے متبنیٰ تھے، ۷ر ذیقعدہ =۲۳ر اگست کو ان کی رحلت واقع ہوگئی، نماز و تلاوت اور احکام شرع کے بہت پابند تھے، اور بہت سیدھے اور سادے انسان تھے۔ شروع ہی سے کمزور اور لاغر جسم کے آدمی تھے، رمضان المبارک کے بعد علاج کی غرض سے بمبئی گئے، وہاں مدرسہ امدادیہ میں جناب قاری نسیم الحق صاحب معروفی کے ہاں مقیم تھے، اور وہیں ان کا وقت موعود آپہنچا، انتقال کے بعد بذریعہ طیارہ ان کا جسد خاکی مئو لایا گیا، ۸ر ذیقعدہ =۲۴ر اگست کو عصر کی نماز کے بعد سرپرست المآثر حضرت مولانا رشید احمد الاعظمی مدظلہ کی امامت میں نماز جنازہ ادا کی گئی، اور آبائی قبرستان میں تدفین ہوئی۔

..........................................

## حضرت محدث کبیرؒ کے خادم خاص
## قاری بشیر احمد صاحب

یکم ستمبر بروز منگل شب کے تقریباً ۱۰ $\frac{1}{2}$ بجے حضرت محدث کبیر رحمۃ اللہ علیہ کے خادم خاص اور ہر وقت کے حاضر باش قاری بشیر احمد صاحب کا کئی مہینے کی طویل علالت کے بعد انتقال ہوگیا انا للہ وانا الیہ راجعون۔ قاری صاحب نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی پوری عمر نہایت اخلاص وعقیدت کے ساتھ خدمت کی تھی، اور حضرت بھی ان کے اوپر غایت درجہ شفقت اور نظر عنایت فرمایا کرتے تھے، سفر میں بھی اکثر ان کو ساتھ رکھا کرتے تھے، ہندوستان کے کم مقامات ہوں گے جہاں وہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ سفر میں نہ گئے ہوں، حضرت نے جب مرقاۃ العلوم قائم کیا تو شعبۂ پرائمری کے درجۂ اطفال میں بچوں کو ناظرہ پڑھانے کے لیے ان کو مدرس مقرر کیا، اس کے بعد سے سفر کی رفاقت کا

سلسلہ تقریباً منقطع ہوگیا، لیکن گھر پر وہ حضرت کی برابر خدمت کرتے رہے۔ گزشتہ کئی سال سے شوگر کے عارضہ میں مبتلا تھے، اس بیماری نے ان کو اندر سے بالکل کھوکھلا کردیا، اور تقریباً آٹھ مہینے سے وہ بالکل صاحب فراش رہے۔ بالآخر اس سے جانبر نہ ہوسکے۔ ۱۷؍ذیقعدہ =۲؍ستمبر بروز چہارشنبہ ۱۰ بجے دن میں حضرت مولانا رشید احمد الاعظمی مدظلہ کی امامت میں جنازے کی نماز اور آبائی قبرستان واقع لب دریا میں تدفین ہوئی۔

اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ تمام مرحومین کی مغفرت فرمائے، ان کے درجات کو بلند فرمائے، اور ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے، اور سب کے پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عنایت فرمائے آمین۔

..................................................

## قاری مشتاق احمد خیرآبادی

۲؍ذی الحجہ ۱۴۳۶ھ مطابق ۱۶؍ستمبر ۲۰۱۵ء بروز جمعرات مدرسہ مرقاۃ العلوم کے تجوید وقرأت کے استاد قاری مشتاق احمد صاحب خیرآبادی کی رحلت ہوگئی، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

قاری صاحب ایک تجربہ کار اور اپنے فن کے ماہر استاد تھے، مشہور اور ماہر فن استاد قاری ظہیرالدین صاحب معروفی کے تلامذہ میں تھے۔ عرصۂ دراز سے تجوید وقرأت کے ذریعہ قرآن کریم کی عظیم خدمت انجام دے رہے تھے، بہت سے مدارس میں انھوں نے تعلیم وتدریس کی خدمت انجام دی ہے۔ تقریباً اٹھارہ سال سے مدرسہ مرقاۃ العلوم میں مدرس تھے، اس طویل مدت میں انھوں نے اپنے فریضۂ تدریس کی ادائیگی میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ وقت کے پابند تھے، خیرآباد، مئو سے تقریباً ۲۵؍کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ اتنی طویل مسافت روزانہ سائیکل سے طے کرتے تھے، اس کے باوجود روزانہ وقت سے پہلے مدرسہ پہنچ جایا کرتے تھے۔

بہت محنتی اور جفاکش انسان تھے، کام سے گھبراتے نہیں تھے، اور اپنا کام خود اپنے ہاتھ سے کرتے تھے۔ طبیعت میں سادگی اور شرافت تھی، ان کے پاس پڑھنے والے طلبہ ان سے مانوس رہا کرتے تھے۔ ان کی وفات سے ایک بڑا خلا پیدا ہوگیا ہے، اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ اس کو اپنے فضل سے دور فرمائے۔ ان کی مغفرت فرمائے، اپنی رحمت کا سایہ فرمائے، اور تمام پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عنایت فرمائے۔